وہ قربتیں یہ فاصلے



رفعت زیبا

وہ قربتیں
— یہ فاصلے

رفعت زیبا

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور • حیدرآباد • کراچی

طابع ...... شیخ نیاز احمد
مطبع ...... علمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور
قیمت ...... RS10..00

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

اِنتساب

اُن کے نام جنھوں نے مجھے محرومیاں دیں !

اور . . . .

اور اُن محرُومیوں کے نام !
جنھوں نے میرے فن کو جِلا بخشی !!

رفعت زیبا

○

"ہر انسان کو محبّت کی ضرورت ہوتی ہے!
محبّت کے بغیر،
اُس کی رُوح کا سرچشمہ خشک،
اور
جسم راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے!"

○

اِس ناول میں

ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے۔ جسے اس کے والدین کے تعلقات نے مرد سے ـــــ نفرت کرنا سکھایا تھا ـــــ اس نے مرد پر اپنی زندگی کے دروازے ہمیشہ کے لیے ـــــ بند کر لیے تھے ـــــ جیسے وہ اب کسی مرد کو اپنی زندگی میں داخل نہیں ہونے دے گی ـــــ لیکن ایسا نہیں ہو سکا ـــــ ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا ـــــ

ایک ایسے مرد کی کہانی ہے ـــــ جو مردانہ خصوصیات کا مکمل نمونہ تھا۔ جسے اپنی شخصیّت کا احساس بھی تھا ـــــ وہ خوبصورت لڑکیوں سے ملتا تھا ـــــ اس لیے نہیں ـــــ کہ ان کے دامِ محبت میں گرفتار ہو جائے ـــــ انھیں شکار کرنے کے لیے ـــــ وہ ان کے بے حد نزدیک ہو جاتا تھا، بہت دُور رہنے کے لیے ـــــ

ـــــ اور بینا ـــــ جس نے اپنی زندگی کے دروازے مرد پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیے تھے ـــــ اسے دیکھتے ہی مسحور ہو گئی۔ وہ اس کے قریب ہوتی چلی گئی اس کی زندگی کے دروازے اس کے لیے ـــــ ہر وقت کھُلے رہنے لگے

—— پاٹوں پاٹ ——

اور ۰۰۰۰۰۰۰ اس دروازے میں داخل ہوتا تھا — مگر واپس آجانے کے لیے —— وہ اسے نہ روک سکی —— وہ اسے اپنا سب کچھ دے کر بھی اپنا نہ سکی ——

کیوں کہ دولت کی چمک نے —— اس کی بصیرت زائل کر دی تھی — اس نے ایک لڑکی کو رفیقِ حیات چُن لیا —— جس نے دولت کے انبار تو اس کے گھر میں لگا دیے — لیکن —— اُس کے اِس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ دُور رہی —— دُور ہوتی چلی گئی —— یہاں تک کہ — زندگی کے یہ پُر پیچ راستے ایک دوسرے سے اتنے الگ ہو گئے، کہ اسے اپنی رفیقۂ حیات کو —— ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا پڑا — اس نے طلاق دے دی ——

اور —— زندگی کے اسی موڑ پر —— بینا سے پھر ٹکراؤ ہو گیا — اب بینا کا انداز ہی اور تھا —— وہ تو اس کی پریشانیاں —— اس کی اُلجھنیں دُور کرنے آئی تھی، اپنا حالِ دل کہنے نہیں آئی تھی — اس نے اپنے خون سے —— اسے دوبارہ زندگی عطا کر دی —— مگر خود دُور رہی — بہت دُور ——

اتنی عمدہ ناولیں —— بہت کم لکھی جاتی ہیں ——
جذبات نگاری —— کا کمال یہ ہے —— کہ مصنفہ نے ایسی ایسی چیز دل کو چھوا ہے —— جن پر عام طور پر دھیان نہیں دیا جاتا۔

انھیں چھُونے کا انداز بھی ایسا حشر ساماں ہے کہ —— قاری یہ انداز دیکھ کر —— اس دنیا میں رہنے نہیں پاتا —— بس جی یہی چاہتا ہے —— کہ جذبات کا یہ بہتا دھارا —— اسی زور شور سے بہتا رہے ——

یا پھر ——
وقت ہی کی رفتار رُک جائے۔

شارب ظفر

○

اپنا لہو - تیری رعنائی - تاریکی اِس دُنیا کی
میں نے کیا کیا رنگ چُنے ہیں دیکھوں کیا تصویر بنے

احمد فراز

۱

اِس موسم کا انتہائی سرد دِن ہے۔ باہر یخ بستہ ہوائیں چل رہی ہیں۔ اور برف رُوئی کے ننھے ننھے گالوں کی مانند گر رہی ہے۔ زمین سفید مخملیں فرش کی طرح سفید اور بے داغ ہے۔ پہاڑوں کی سُرمئی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہُوئی ہیں۔ میرے کمرے کا دریچہ کُھلا ہے، اور مَیں سیاہ شال کاندھوں پر ڈالے، کتنی ہی دیر سے یہاں کھڑی ہُوں۔ میرے ہاتھ سرد ہو رہے ہیں، لیکن یہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا —— دُور دُور تک کوئی متنفّس نظر نہیں آ رہا —— ہوسٹل کی بُہت سی لڑکیاں چھُٹیاں گزارنے اپنے گھروں کو جا چکی ہیں، اور جو چند ایک یہاں ہیں، وُہ دروازوں اور کھڑکیوں پر بھاری پردے گرائے، آتشدان میں آگ جلائے، اپنے اپنے لحافوں میں دُبکی ہُوئی ہیں —— مَیں اپنے کمرے میں تنہا ہُوں —— تنہا اور اُداس —— اُداسی نے پُوری طرح میرے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، میرا ذہن بوجھل ہو رہا ہے۔ کاش، کوئی ایسا ہو —— جس کے سامنے مَیں اپنے دُکھوں کا اظہار کر سکُوں۔ جو میری بات غور سے سُنے، اور جس کے ہمدردی اور

محبت کے چند میٹھے بول میرے ذہن کے اِس بوجھ کو ہلکا کر دیں، —— لیکن —— یہاں کون ہے، کوئی بھی نہیں ——

مَیں چاہوں —— تو اِن لڑکیوں کے کمروں میں جا سکتی ہوں —— جن میں ایک میں کھنہ ہے، موٹے موٹے نقوش والی وُہ کریچین لڑکی —— جسے سوائے اِس بات کے کوئی دُوسری بات نہیں سُوجھتی کہ لڑکے میری طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے، —— راحیلہ! جسے ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے کہ آج کل کون کون سے ڈیزائن زیادہ مقبول ہیں، بالوں کا کون سا سٹائل اُس کے چہرے پر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اُس کے چہرے پر تل کیوں نکلنے لگے ہیں اور اِن کے علاوہ نیلی آنکھوں اور سُنہری بالوں والی بیہلیں، جسے اپنے فراق کے مارے ہُوئے لڑکوں کی داستانیں سُنانے سے ہی فُرصت نہیں ملتی۔

اور اِن سب سے مختلف ہوسٹل کی وارڈن!

جسے لڑکیوں کو ڈانٹنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا —— سونے کی بیل بج چُکی ہے، آپ اب تک سوئی کیوں نہیں ——!

یہ آپ کے مُطالعے کا وقت ہے —— اِس وقت آپ باتوں میں کیوں مشغول ہیں ——!

جسے دیکھتے ہی لڑکیاں مُنھ بنا کر کہتی ہیں :

لو —— ٹائم ٹیبل آگیا ہے —— دیکھ لو —— اِس وقت تُمھیں کیا کرنا چاہیے تھا ——!

اِن سب کے خیالات مجھ سے بہت مختلف ہیں —— وہ سب زندگی اور اُس کی رعنائیوں میں اس قدر مگن ہیں —— کہ انھیں دوسرے کے دُکھوں کا اِحساس تک نہیں ہو سکتا —— لیکن اس وقت میں احساسِ تنہائی سے پریشان ہوں —— مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے، —— جسے میں اپنی کہانی سُنا سکوں —— اپنے غموں کی —— اپنی چھوٹی چھوٹی مسرّتوں کی باتیں کر سکوں —— لیکن یہاں کون ہے —— کوئی نہیں —— کوئی بھی نہیں!

ہوا کا ایک تیز جھونکا دریچے کی راہ سے کمرے میں داخل ہوا —— اور میز پہ رکھی ہوئی سیاہ نوٹ بک کے کاغذ پھڑ پھڑانے کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا —— میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا —— مجھے کسی سے اپنی باتیں ہی کہنی ہیں نا —— تو پھر صرف کسی انسان کا ہی سہارا کیوں لوں —— جو زخموں پر نمک پاشی ہی کر سکتے ہیں —— مرہم نہیں رکھ سکتے، جو ذرا ذرا سی بات کو پھیلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ سیاہ جلد والی نوٹ بک میری بہترین ساتھی ثابت ہو سکتی ہے، یہ میرے ہر راز —— ہر غم کو اپنے سینے میں چھپا لے گی —— اس کی بے زبانی میرے کسی راز کو افشاں نہ کر سکے گی —— تو پھر میں اس کو کیوں نہ اپنا ساتھی —— اپنا ہمدم تصوّر کروں —— میں اسے کس نام سے مخاطب کروں —— بھلا کبھی کسی نے نوٹ بک کا نام بھی رکھا ہے، ——

ہُونہہ ـــــ اگر نہیں رکھا، تب بھی میرے لیے کیا فرق پڑتا ہے،
میں اِس کا نام رکھنا چاہتی ہُوں ـــــ نومی ـــــ ٹھیک ہے۔
جب اور سب چیزوں کے نام ہو سکتے ہیں ـــــ تو پھر اس سیاہ
جلد والی نوٹ بُک کا نام کیوں نہیں ہو سکتا ـــــ

تو پھر آؤ نومی !
آج تم سے کچھ باتیں کہہ ہی ڈالوں ـــــ

○

یکم جنوری ۱۹۵۵ء

نومی پیاری! ــــــ آج مَیں بہت اداس ہُوں ــــــ تم پُوچھو گی، کِس لیے ــــــ تو نومی ڈیئر اصل بات یہ ہے، کہ کل ہوسٹل کی تمام لڑکیوں کو اُن کے بھائی، والد اور بہنیں لینے کے لیے آئے تھے اور وُہ سب اِس تصوّر سے کِس قدر مسرُور نظر آ رہی تھیں ــــــ کہ یہ دو ماہ وُہ اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاریں گی ــــــ اُن کے چہرے دمک رہے تھے، آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں، اور وُہ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے میں مصرُوف تھیں۔ پھر وُہ سب ہم سے ہاتھ ملا کر چلی گئیں۔ تب مجھے اچانک اپنے گھر کا خیال آیا ــــــ کاش، مجھے بھی کوئی لینے آتا ــــــ تو مَیں بھی اِس وقت اپنے گھر میں، دہکتے آتش دان کے نزدیک بیٹھ کر اپنی امّی سے باتیں کر رہی ہوتی ــــــ لیکن یہ سب صرف سوچنے کی حد تک محدُود تھا ــــــ کیوں کہ ــــــ مجھے لینے کوئی نہیں آیا تھا ــــــ اور ہمیشہ کی طرح اب بھی مجھے یہ چھُٹیاں اِسی ہوسٹل کی چار دیواری میں گزارنا تھیں ــــــ ہمیشہ کی طرح ــــــ اِس کمرے کی سرد دیواروں میں تنہائی سے مسلسل بور ہونا تھا ــــــ

فرق صرف اتنا ہے، کہ پہلے میں اسکول کے بورڈنگ میں رہتی تھی، اور اب کالج کے احاطے میں بنے ہوئے ان کمروں میں رہتی ہوں —— جب سے میں نے ہوش سنبھالا —— اپنے آپ کو انہیں کمروں میں مقید پایا —— جہاں ہر گھڑی میری نگرانی ہوتی ہے، یہ سونے کا وقت ہے، سو جاؤ —— کھانے کی بیل بج چکی ہے، جاکر کھانا کھالو، اور یہ وقت مطالعے کا ہے، اس وقت تمہیں لائبریری میں ہونا چاہیے —— چاہے جی چاہے یا نہ چاہے —— آپ کو مشین کی طرح وقت کی پابندی کرنی ہوگی، گویا آپ انسان نہیں —— کل کے پرزے ہیں، جس طرف گھمایا —— گھوم گئے، ہائے —— چاندنی راتوں میں کس قدر جی چاہتا ہے، کہ سبزے کے لان میں گھنٹوں بیٹھا جائے —— اور چاندنی میں گھری کائنات کو دیکھا جائے، جب ہر طرف خاموشی، اور تنہائی ہو —— ذہن میں کیسے کیسے خوبصورت خیال جنم لیتے ہیں — جی چاہتا ہے، کہ زندگی انھیں تصورات میں کھوئے ہوئے بیت جائے —— لیکن جناب —— جہاں آپ کو باہر نکلے دیر ہوئی —— مسز اختر (ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ) آپ کو تلاش کرتی ہوئی پہنچ جائیں گی —— اوہ —— کس قدر سردی ہے، آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں، یہ عمر تنہائی میں بیٹھ کر وقت برباد کرنے کی نہیں، یہ عمل کرنے کا وقت ہے، اس وقت تمہیں صرف اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے —— اور بس —— چلیے اپنے کمرے میں ——

اگر آپ کو ٹھنڈ لگ گئی، تو کئی دِنوں تک تیمارداری کرنی پڑے گی۔ لیجیے جناب، آپ کے خوبصورت تخیّل کا شیرازہ بکھر گیا، اور آپ کو قہرِ درویش، بر جانِ درویش کے مصداق مسز اختر کے ہمراہ واپس آنا پڑے گا۔

وُہ نہایت سنجیدگی سے آپ کو بستر میں لیٹنے کا مشورہ دے کر چلی جائیں گی، اور آپ دِل ہی دِل میں اُنھیں کوستے ہُوئے پھر دِن بستر پر کروٹیں لیتی رہیں گی، —— تو نو می ڈیئر! —— یہ ہے یہاں کی زندگی —— کبھی کبھی تو اتنی اُکتا جاتی ہُوں —— جی چاہتا ہے، یہاں سے نِکل بھاگوں —— لیکن جاؤں گی کہاں؟ یہ سوچ کر مجبوراً یہاں رہنا پڑتا ہے۔

کتنا کتنا جی چاہتا ہے، کہ چُھٹیاں اپنے گھر گزاروں، جہاں کوئی پابندی نہ ہو —— جب جی چاہے —— بستر سے اُٹھیں، اور جب جی چاہے، گھُومنے نِکل جائیں —— سردیوں کے اِن دنوں میں جب آتش دان میں آگ جل رہی ہو —— آگ کے قریب بیٹھ کر اپنی پسندیدہ کتابیں پڑھی جائیں —— یا پھر دریچے سے باہر گرتی ہوئی برف کا نظّارہ کیا جائے —— اللہ! —— جب برف پڑتی ہے، تو کتنا اچھا لگتا ہے، گھنٹوں دیکھتے رہنے سے بھی اِنسان نہیں اُکتاتا —— کتنی چھوٹی چھوٹی خواہشات ہیں یہ —— لیکن زندگی کے لیے کتنی اہم ہیں —— مگر حسرت ہی رہی کہ یہ

تمنّا بر آئے ـــــــ

میں خُوب جانتی ہُوں ـــــ کہ ہر مرتبہ کی طرح اِس بار بھی ممّی ایک دو روز بعد آئیں گی ـــــ اور مجھے یہ نصیحت کریں گی ـــــ تم ہوسٹل میں رہ کر جتنی توجہ سے پڑھ سکتی ہو، اتنی توجہ تم گھر پہ نہ دے سکو گی، اور پھر میں بھی تو روزانہ آفس جاتی ہُوں۔ تُم گھر پہ اکیلی بور ہوتی رہو گی۔ دیکھو نا یہاں ـــــ تمھاری کتنی پیاری پیاری کلاس فیلو ہیں، تمھارا وقت تو اچھا کٹ جاتا ہوگا ـــــ اور میں چاہتے ہُوئے بھی نہ کہہ سکوں گی، کہ میں یہاں کی زندگی سے اُکتا گئی ہُوں ـــــ ہائے، ممّی کِتنا کِتنا جی چاہتا ہے کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو ـــــ میں وعدہ کرتی ہُوں، کہ گھر پر بھی میں اتنی ہی توجہ سے پڑھوں گی ـــــ جب تم آفس چلی جایا کرو گی ـــــ تو میں تمھارے لیے کھانا تیار کیا کروں گی۔ گھر کے صحن میں لگے ہُوئے پھُولوں کو پانی دیا کروں گی ـــــ کمروں کو سجایا کروں گی ـــــ اور جب تم لوٹ کر آؤ گی ـــــ تو ساتھ کھانا کھائیں گے ـــــ ممّی میں تو ترس گئی ہُوں ـــــ تمھارے پاس بیٹھنے کو، تم سے باتیں کرنے کو ـــــ لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گی ـــــ بس صِرف ایک نظر ممّی کو دیکھ کر رہ جاؤں گی ـــــ اُن کی متورّم آنکھیں ـــــ سفید ساری میں ملبُوس وُہ دُبلا پتلا پیکر ـــــ میری زبان پر قفل لگا دے گا ـــــ

ہائے ـــــ بیچاری ممّی ـــــ کتنی دُکھی ہیں ـــــ میں اب خُوب سمجھتی ہُوں، کہ تم کیوں چاہتی ہو ـــــ کہ میں گھر میں نہ رہوں ـــــ

مجھے اس کا بخوبی علم ہے، کہ پپّا کا رویّہ ممّی کے ساتھ ٹھیک نہیں،
گو وہ میرے بچپن کا زمانہ تھا —— جب ایک مرتبہ میں چھٹیاں گزارنے
گھر گئی تھی —— تب میں نے دیکھا —— کہ پپّا آدھی آدھی رات
تک گھر سے باہر رہتے ہیں، اور جب واپس لوٹتے ہیں —— تو
اُن کے مُنہ سے کتنی ناگوار بُو آتی ہے —— آنکھیں سُرخ ——
اور بال اُلجھے ہُوئے تھے —— ایسے میں وہ بات بات پر گالیاں
دینے لگتے تھے —— تب ممّی گھبرائی ہُوئی نظروں سے مجھے دیکھتے
ہُوئے پپّا کو دوسرے کمرے میں لے جاتی تھیں —— اور پھر کتنی ہی
دیر تک اُس کمرے سے چیزیں پھینکنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں ——
جب ذرا سکون ہوتا، تو ممّی اپنے کمرے میں لوٹتیں —— اور مُنہ
ڈھانپ کر لیٹ جاتیں —— اور پھر —— کمرے میں کتنی ہی دیر
تک اُن کی دبی دبی سسکیاں گونجتی رہتیں —— گو یہ بہت پہلے
کی بات ہے —— لیکن ایسا لگتا ہے —— جیسے یہ تمام باتیں میرے
دل و دماغ پر نقش ہو گئی ہیں —— میں جانتی ہُوں —— کہ ممّی مجھے
اِس لیے گھر نہیں لے جاتیں —— کہ اِن تمام باتوں کا مُجھ پر بُرا اثر
نہ پڑے —— بیچاری ممّی —— جوانی میں ہی کیسے کیسے دُکھوں
نے اُن کو گھیر لیا ہے —— چھوٹی سی تھیں —— تو ماں باپ اکیلا
چھوڑ کر چل بسے —— تب وُہ کتنے ہی سال اپنے عزیزوں کے
ٹکڑوں پر پلتی رہیں —— شادی ہُوئی —— تو شوہر کی طرف سے

کوئی سکھ نہ ملا ـــــ اُن کی جوانی کی کلیوں نے پت جھڑ کے سوا کچھ بھی نہ دیکھا ـــــ اُن کا دورِ بہار ہمیشہ خزاں رسیدہ رہا ـــــ اُنھوں نے تو اپنی زندگی خود بنائی تھی، شوہر کی بے اعتنائی ـــــ رشتہ داروں کے مظالم ـــــ اور ـــــ دُنیا والوں کی خود غرضی کو صرف دیکھا ہی نہ تھا ـــــ بلکہ حالات کی چکّی میں ـــــ وُہ زندگی کی تمام اذیّتوں ـــــ دُکھوں ـــــ پریشانیوں کے ساتھ پسی بھی تھیں ـــــ زندگی کے کھرے سیدھے اقتصادی، بدحالی اور معاشی جدو جہد کے کٹھن تجربات نے اُنھیں صابر بنا دیا تھا ـــــ اور اب تو جیسے اُنھوں نے اِن حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا ـــــ سارا سارا دِن ـــــ ٹائپ رائٹر کی مشین پر جھکی وہ کام کرتی رہتی تھیں، اور اس کے بعد جو پیسے اُنھیں ملتے تھے، اُن میں سے بیشتر وُہ میرے تعلیمی اخراجات پر صَرف کر دیا کرتی تھیں، کتنا شوق تھا اُنھیں کہ مَیں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں ـــــ مجھے اس کا احساس تھا کہ میرے اخراجات پُورے کرنے کے لیے، کتنی کتنی دیر تک اُنھیں اوور ٹائم کام کرنا پڑتا ہے ـــــ اور اِس کے بعد اُن کے اخراجات کے لیے جو بچتا تھا، وُہ اُن کے لیے بہت ناکافی تھا ـــــ کتنے عرصے سے مَیں نے اُن کے جسم پر نیا لباس نہ دیکھا تھا، اور عورتوں کی طرح کبھی اُنھوں نے کوئی زیور نہ پہنا تھا ـــــ کبھی میک اَپ نہ کیا تھا ـــــ اب تو ان کی ایک ہی تمنّا تھی، کہ مَیں پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جاؤں، کبھی کبھی تو مَیں سوچتی ہُوں، کہ پڑھنا چھوڑ کر کسی سکول میں سروس کر لوں، تاکہ ممّی کا بوجھ

کچھ تو ہلکا ہو، ایک بار مَیں نے اپنے اِس خیال کا اظہار کیا ـــــ تو وُہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں، کہنے لگیں، زندگی نے مجھے کچھ نہیں دیا ـــــ اب میری تمنّاؤں کا مرکز تم ہو، کیا تم بھی مجھے دُکھ دینا چاہتی ہو، میری خواہش ہے کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کرو، تاکہ اِس معاشرے میں باعزّت طریقے سے زندہ رہ سکو، تمھیں ابھی کچھ نہیں سوچنا چاہیے، تمھیں صرف اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے، اور بس ـــــ

پھر مَیں کچھ نہ کہہ سکی، کچھ نہ سوچ سکی، مَیں ممی کو دُکھ دینا نہیں چاہتی ـــــ مَیں نے اپنی تمام توجہ اپنی تعلیم کی طرف مبذول کر دی ہے، میرا نصب العین تعلیم حاصل کرنا ہے، کیونکہ ـــــ ممی یہ چاہتی ہیں۔

ہر سال مَیں کلاس میں پوزیشن حاصل کرتی ہُوں ـــــ تمام ٹیچرز مجھ سے خوش ہیں ـــــ اور لڑکیوں کو وُہ میری مثال دیتی ہیں ـــــ لڑکیاں مجھے رشک سے دیکھتی ہیں ـــــ مجھ سے دوستی بڑھانے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ لیکن اِن تمام باتوں کے باوجُود کبھی کبھی مَیں لاکھوں کروڑوں اِنسانوں کی اس دُنیا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہُوں ـــــ یُوں لگتا ہے، جیسے اِتنے بہت سے انسانوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں، جسے مَیں اپنا کہہ سکوں ـــــ سب اجنبی ہیں ـــــ اِتنے قریب رہتے ہُوئے بھی ہمارے درمیان ہزاروں میلوں کا فاصلہ ہے ـــــ اور کوشش کے باوجُود بھی مَیں اِن ذہنی فاصلوں کو ـــــ عبُور نہیں کر سکتی ـــــ !

باہر برف تیزی سے گر رہی ہے ——— یخ بستہ ہوائیں چل رہی ہیں ——— سُوکھے زرد پتّے اِدھر سے اُدھر ——— بھٹکتے پھر رہے ہیں، رات بہت تاریک ہے، مَیں لکھتے لکھتے تھک گئی ہُوں، اب مجھے کچھ دیر آرام کر لینا چاہیئے۔

اچھا نومی ڈیئر! ——— مجھے اجازت دو ——— زندگی رہی ——— تو پھر سہی ——— !

○

۱۵- جنوری ۱۹۵۵ء

دیکھا تم نے، نومی! ـــــ وہی ہُوا جس کا مجھے ـــــ اندیشہ تھا ـــــ کل ممّی آئی تھیں، اور مجھے حسبِ معمول وہی کہا ـــــ جس کا مجھے یقین تھا ـــــ یہی کہ ـــــ میں ہوسٹل میں رہوں ـــــ اور ـــــ اپنی تعلیم کی طرف یکسوئی سے ـــــ متوجہ رہوں ـــــ ممّی دو گھنٹے میرے پاس رہیں ـــــ بے چاری ممّی ـــــ پہلے سے بہت کمزور ہو گئی ہیں ـــــ میں نے پپّا کو پوچھا، تو کہنے لگیں ـــــ بالکل ٹھیک ہیں ـــــ بہت مصروف تھے ـــــ اس لیے نہ آسکے ـــــ ہاں ـــــ البتہ تمھارے لیے اُنھوں نے ـــــ یہ چیزیں بھیجی ہیں، ـــــ میں نے پیکٹ کھولا ـــــ تو ہلکے سبز رنگ کا سُوٹ نکلا۔ ـــــ اور ـــــ کچھ نوٹ تھے، اللہ ـــــ ممّی، اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی فریب دیتی ہیں ـــــ پپّا کو اتنی فرصت کہاں ـــــ کہ اُنھیں میرا خیال آئے، اگر اُنھیں میرا خیال ہوتا ـــــ تو کیا آج میں اِس طرح ہوسٹل میں پڑی ہوتی ـــــ اور ممّی ـــــ

بے چارہ — یُوں دُکھی ہوتیں — مجھے اچھی طرح احساس ہے ،
— کہ ممّی نہیں چاہتیں — کہ میرا دِل پپّا کی طرف سے بُرا ہو —
میری ماں — کتنی عظیم ہے — پپّا نے آج تک — اُنھیں
آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دیا — اور وُہ اب نہیں چاہتیں —
کہ میرے اور پپّا کے درمیان نفرت کی خلیج حائل ہو — جب
بھی انھیں موقع ملتا ہے ، وُہ کہتی ہیں — وُہ جیسے بھی ہیں —
تمُھارے باپ ہیں — تمھیں اُن کا احترام کرنا چاہیئے —
لیکن — میرے دل میں پپّا کے لیے کوئی جذبہ نہیں — وُہ
تو ہمارے لیے غیر ہیں — میری ماں کو انھوں کے کتنے دُکھ ،
— کتنے غم دیئے ہیں ، جنھیں وُہ سینے سے لگائے —
آہستہ آہستہ اپنی زندگی کو ختم کر رہی ہیں —

کل — ممی دو گھنٹے میرے پاس رہیں — اُنھوں
نے بہت پیاری پیاری — باتیں کیں — اپنے ہاتھ کے
بنائے ہوئے کباب اور سویّوں کا حلوہ کھلایا — جو وہ گھر سے
میرے لیے لائی تھیں —

وُہ وقت — کتنی جلد گزُر گیا — وقت کے
گزُرنے کا ہمیں ذرّہ بھر بھی احساس نہ ہُوا —

پھر —

ممّی نے مجھے پیار کیا — اور چلی گئیں !

تب ——

میں کتنی ہی دیر —— بستر میں منھ چھپائے لیٹی رہی ——
تنہائی کا احساس پہلے سے بھی بڑھ گیا —— اور دل ابھی تک
افسردہ ہے۔

○

۲۵ - جنوری ۱۹۵۵ء

دن کتنے اداس اور ویران ہیں ——— گزشتہ دو دن سے مسلسل برف پڑ رہی ہے۔ سردی بہت بڑھ گئی ہے، باہر خزاں رسیدہ ہوائیں ——— زرد زرد پتّوں سے گلے مل مل کر روتی ہیں ——— درخت کسی بانجھ عورت کی مانند ٹُنڈ مُنڈ کھڑے ہیں۔ خاموش ——— سر جھکائے ...... آتش دان میں چوبیس گھنٹے آگ جلتی رہتی ہے، ——— اس کے باوجود سردی محسوس ہوتی ہے میں سارا سارا دن کتابوں میں مغز کھپاتی رہتی ہوں ——— یا ——— لحاف میں دُبکی، ناولوں میں کھونے کی کوشش کرتی رہتی ہوں ——— آج کل ہوسٹل میں بھی سنّاٹا چھایا رہتا ہے، ——— باقی لڑکیاں بھی بال بکھرائے ——— بے دلی سے ایک دوسری سے گفتگو کرتی ہیں ——— ایسا لگتا ہے ——— جیسے موسم سب پر اثر انداز ہو رہا ہے، کئی دنوں سے سورج نے اپنی جھلک نہیں دکھائی۔ سیاہ بادل ہر وقت آسمان پر چھائے رہتے ہیں ——— یہ سردیاں بھی ایک مصیبت ہیں ——— نہ جانے کب ختم ہوں گی۔

آج سہ پہر کو بستر میں لیٹی ——— سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ——— کہ سیمیں، راحیلہ کو ساتھ لیے میرے کمرے میں داخل ہوئی ——— اور کہنے لگی :

"تم ہم سے بہت کھنچی کھنچی رہتی ہو ——— بنیا ——— ! ایک تو موسم اس قدر بور ہے ——— کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا، اور سونے پہ سہاگہ ——— یہ کہ ہم الگ الگ پڑے رہتے ہیں، کبھی ہمارے کمروں کی طرف بھی رُخ کر لیا کرو ——— اب ایسی بھی کیا بیزاری ۔"

اُس کے اس طرح شکوہ کرنے سے مجھے بہت ندامت ہوئی۔ واقعی سچ ہی کہہ رہی تھی ——— سیمیں ——— سوائے کھانے کی میز کے ——— ملاقات نہ ہوتی تھی۔ اس کے بعد میں کئی دنوں سے ان لوگوں کے پاس نہیں گئی تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر راحیلہ نے لحاف کھینچ کر الگ پھینک دیا۔ اور شوخی سے بولی :

" اب بڑی بی ——— اپنے حجرے سے باہر نکلو ——— ہمارے کمرے میں مس کھنہ بیٹھی ہے، چلو ——— کیرم کی بازی ہو جائے ۔"

میں نے شال لی، اور ہم سیمیں کے کمرے میں آ گئے !

کافی دیر تک ہم کیرم کھیلتے رہے، میں اور راحیلہ پارٹنر تھے، ہم نے سیمیں اور کھنہ کو ۸ پوائنٹ سے ہرا دیا۔

سیمیں کے گھر سے ڈرائی فروٹ آیا تھا ——— اُس نے وہ

کھانے کو دیا ــــــ ہم لوگ آتش دان کی بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے بیٹھ کر اخروٹ اور چلغوزے کھاتے ــــ اور بے مقصد باتیں کرتے رہے۔

شاید مسز اختر آج کہیں گئی ہوئی تھیں ــــ جبھی کوئی ہمیں دیکھنے نہ آیا تھا ــــــ ورنہ وُہ کہاں اتنی رات تک بیٹھنے دیتی ہیں ــــــ بہُت دیر بعد میں اُن کے کمرے سے لوٹی ــــــــ سوچا ــــــ تم سے کچھ ــــ کہہ ڈالوں ــــ اچھا ــــ ــــ باقی ــــ باقی ــــ!

○

۵ر فروری ۱۹۵۵ء

آج بہت دنوں بعد سورج نے کسی شرمیلی دُلہن کی طرح —— بادلوں کی اوٹ سے جھانکا، ہلکی ہلکی سنہری دُھوپ چہار سُو پھیلی ہوئی ہے —— دن بہت روشن ہے —— اِتنے دنوں کی تاریکی کے بعد دُھوپ کی یہ سنہری کرنیں کتنی پیاری معلوم ہو رہی ہیں۔ اتنے دنوں سے کمروں میں قید رہ کر ہم لوگ سخت گھبرا گئے تھے —— ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ لان میں نکل آئے. کافی دیر تک باہر ٹہلتے رہے۔

سیمیں کہنے لگی :

"موسمِ بہار میں تو سب ہی پکنک مناتے ہیں —— آج ہم لوگ خزاں میں کیوں نہ پکنک مناکر نئی روایت قائم کریں۔"

"ہاں —— کیوں نہیں —— ہم تمہاری رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔" ہم یکبارگی بول اُٹھے —— سچّی بات تو یہ ہے —— کہ ہم کمروں میں بند رہ کر سخت بور ہو چکے تھے —— چلو اسی بہانے سہی —— کچھ تو نیا پن ہونا —— !

راحیلہ اور سیمیں مسز اختر کو منانے کے لیے آفس کی طرف چلی گئیں ـــــ میں اور کھنہ اپنے کمروں کی طرف بڑھے، تاکہ لباس وغیرہ تیار کر لیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں بھی آگئیں ـــــ چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے ـــــ سانس پھولی ہوئی تھی۔

کہنے لگیں :

"ہمیں داد دو ـــــ کیسی تجویز پاس کرائی ہے ـــــ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ ـــــ مسز اختر دوپہر کے کھانے کا سامان منگوا رہی ہیں ـــــ دوپہر کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔"

"واہ ـــــ جواب نہیں سیمیں ڈارلنگ تمہارا ـــــ زندگی بھی یہ پہلا کام تم نے ٹھیک کیا ہے ـــــ" مس کھنہ نے سیمیں کی پشت تھپکی۔

"اونہہ ـــــ کام تو میں نے بہت سے کیے ہیں ـــــ یہ الگ بات ہے کہ تمھیں خبر نہ ہو ـــــ" وہ بولی۔

"اچھا ـــــ اچھا ـــــ اب بحث چھوڑو ـــــ مان لیا، کہ تم بہت ہی اچھی ـــــ اور بہت کام والی لڑکی ہو، ـــــ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ ـــــ کہیں بیگم اختر اپنا ارادہ نہ بدل دیں ـــــ" میں نے دخل اندازی کی۔

"ہاں ـــــ اب نکلو بھی یہاں سے ـــــ جاؤ جلدی کرو ـــــ

راحیلہ نے اُسے باہر کی طرف دھکیلا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم سب تیار ہو چکے تھے، سیمیں نے گہرے نیلے رنگ کی قمیص اور سفید شلوار پہنی تھی —— اور میں نے گہرے سبز رنگ کی ساڑھی پہننا پسند کیا تھا —— کھنہ اور راحیلہ نے گہرے آتشی رنگ کے سُوٹ پہنے تھے۔

ہمارے مُوڈ بے حد خوشگوار تھے۔ ہم لوگ مسز اختر کے کمرے کی طرف بڑھے۔ وُہ تیار ہو چکی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر مُسکرائیں۔

کہنے لگیں:

"خزاں میں بہار کا امتزاج پیش کر رہی ہو تم لوگ —— لیکن بھئی —— تم سب سوئیٹرز بھی پہن لو —— کہیں سردی نہ لگ جائے۔"

سیمیں بھاگ کر ہمارے سوئیٹر اُٹھا لائی —— ہم نے سامان سے بھری باسکٹیں اُٹھائیں —— اور موٹر میں جا بیٹھے، اگلی سیٹ پر چوکیدار اور ڈرائیور بیٹھ گئے —— مسز اختر کے لیے ہم سب نے سُکڑ سُکڑ کر بیٹھنے کے بعد جگہ بنائی، اور وُہ اپنے بھاری بھرکم جسم کو سنبھالتی ہُوئی بیٹھ گئیں۔

خدا خدا کر کے موٹر روانہ ہوئی۔

"بیگم اختر —— کہاں جائیں گے؟" —— راحیلہ نے پوچھا۔

"پہاڑ پر چلیں گے، کیوں کیا خیال ہے؟" بیگم اختر نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے —— جہاں آپ پسند کریں —— ہم تو تھوڑی سی تبدیلی چاہتے ہیں" —— مس کھنہ بولی۔

سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک کے دونوں اطراف بلند و بالا درخت تھے۔ کہیں کہیں شاخوں کے ساتھ اِکّا دُکّا زرد پتّا لرز رہا تھا —— موٹر ہلکی رفتار سے بلندی کی طرف بڑھ رہی تھی —— پہاڑوں کے درمیان بنا ہُوا راستہ فاطمہ جناح سینی ٹوریم تک پہنچتا ہے جو کہ کافی بلندی پر واقع ہے۔ ابھی ہم اُس سے کافی فاصلے پر تھے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں ابھی تک برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ سڑک کے کنارے پر ڈرائیور نے موٹر روک لی، اور ہم لوگ باسکٹیں سنبھال کر اُتر گئے، ڈرائیور نے ڈکی میں سے دری نکالی، اور پہاڑوں کے درمیان صاف جگہ دیکھ کر بچھا دی —— ہم نے سامان وہاں رکھا، اور پہاڑ پر چڑھنے لگے۔

"بیگم اختر —— آپ بھی آیئے نا ——!" سیمیں نے انھیں دعوت دی۔

"نہیں —— اب میں کہاں چڑھوں گی —— تم لوگ جاؤ —— لیکن ذرا سنبھل کر۔"

یہاں بھی وُہ نصیحت کرنے سے نہ چُوکیں۔

ہم لوگ قدم جما جما کر اوپر کی طرف بڑھنے لگے، —— سیمیں ہم سے پہلے اوپر پہنچ چکی تھی —— ہمارے سانس پھُول رہے تھے

اور سردی کے باوجود جسم پسینے سے شرابور تھا —— اُوپر پہنچ کر ہم چوڑے چوڑے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ یہاں سے سینی ٹوریم ایک ننھّے سے ماڈل کی مانند دکھائی دے رہا تھا —— یہاں پہنچ کر ہمیں ٹھنڈک کا احساس ہُوا۔

کتنی ہی دیر تک ہم وہاں بیٹھے رہے —— راحیلہ لطیفے سُناتی رہی —— اور ہم محظوظ ہوتے رہے۔

"اوہ —— ایک بج رہا ہے" —— مِس کھنہ نے کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی —— "چلو —— بیگم اختر کا کھانا پکانے میں ہاتھ بٹائیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم۔" راحیلہ کو بھی خیال آیا۔

ہم واپس پہنچے —— تو بیگم اختر شامی کباب بنانے میں مصروف تھیں، پتھروں کے چُولھے پر فرائی پین میں گھی کھول رہا تھا۔

"بیگم اختر —— آپ کو یہ سُوکھی لکڑیاں کہاں سے ہاتھ لگیں۔" راحیلہ پُوچھ بیٹھی۔

"یہ تو ہم ساتھ لے کر چلے تھے —— مجھے معلوم تھا کہ سُوکھی لکڑیاں یہاں نہ ملیں گی۔"

"اللہ —— آپ کتنی اچھی ہیں" —— سیمیں نے خوشامد کی!

بیگم اختر دھیرے سے مُسکرا دیں۔

"لا یئے ——— اب میں بناؤں گی" ——— میں نے قیمے کی پلیٹ اُن کے سامنے سے اُٹھالی۔

میں گول گول ٹکیاں بنا کر فرائی پین میں رکھنے لگی، اور راحیلہ سُرخ کر کے نکالتی گئی۔

شامی کباب تیار ہونے تک ہماری بھوک عُروج پر ——— پُہنچ چکی تھی۔ سیمیں نے دستر خوان بچھا دیا ——— اور ہم نے کُھلی فضا میں کھانا کھایا۔

کھانا بہت لذیذ تھا ——— اور بھوک بھی سخت لگی ہوئی تھی ——— کھانے کا لُطف آگیا۔

اس سے فراغت پانے کے بعد سیمیں نے ٹرانسسٹر اٹھایا اور ہم کچھ فاصلے پر جا کر چوڑے چوڑے پتھروں پر بیٹھ گئے۔

موسمِ سرما کی دُھوپ کس قدر خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی ——— سیمیں ٹرانسسٹر آن کرنے لگی ——— تو راحیلہ بولی :

"اسے تو روز ہی سُنتے ہیں۔ آج تم لوگ کچھ سناؤ نا"

"تو چلو ——— اِفتتاح تم ہی کرو"

راحیلہ نے ذرا سے تامل کے بعد ——— ایک فلمی گیت سُنانا شروع کیا :

"میرا دل یہ پُکارے آجا۔"

آواز اچھی تھی ـــــ جب اُس نے گانا ختم کیا، ـــــ تو سیمیں بولی :

" بھئی ابھی دل سے کہو ـــ کسی کو نہ پکارے، کیونکہ ابھی ماحول سازگار نہیں۔"

ہم ہنسنے لگے، راحیلہ جھینپ سی گئی، کہنے لگی :

" تم اپنی خبر لو ـــ ہر بات سے نہ جانے کیسے کیسے مطلب اخذ کر لیتی ہو ـــ مَیں نے تو یونہی "......

" ٹھیک کہتی ہو تم ـــ اب اس کی باری ہے۔ یہ کچھ سُنائے گی، چلو سیمیں شروع ہو جائے۔" مس کھنہ بولی۔

" میری آواز بڑی بھونڈی ہے، مَیں نے گانا شروع کیا، تو تم لوگ بھاگ جاؤ گی۔"

" نہیں اب ایسا بھی کیا ـــ یقین رکھو، ہم نہیں بھاگیں گے۔"

مجبُوراً اُسے ماننا پڑا ـــ اُس نے اختر شیرانی کی غزل سُنائی ـــ آواز بس واجبی سی تھی۔ البتہ غزل اچھی تھی۔

اُس کے بعد ـــ مس کھنہ نے اپنی بھاری آواز میں ایک انگلش سونگ سُنایا۔

اس کے بعد میری باری تھی ـــ مَیں نے جان بچانا چاہی، لیکن ـــ بھلا وہ کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھیں ـــ مجھے ہار ماننا پڑی ـــ مَیں نے قدسیہؔ کی غزل شروع کی۔ خاموشی،

تنہائی ـــــ میں اشعار میں کھو سی گئی ـــــ میں نے آخری شعر سُنایا :

اے کاش، علامؔ کوئی ہمیں اِتنا بتا دے
کب تک یہ جگر سوزئ احساس رہے گی

غزل ختم ہوئی، تو سیمیں پکار اُٹھی :

"ونس مور، ونس مور" ـــــ

راحیلہ کہنے لگی :

"بنیا بڑی پیاری آواز ہے تمھاری" ـــــ

"شکریہ!"

"کِتنا سوز ہے تمھاری آواز میں ـــــ ریڈیو پروگرام کرنے لگو، تو کِتنے ہی لوگ ـــــ دیوانے ہو جائیں" ـــــ راحیلہ شرارت سے مُسکرائی۔

"اچھا ـــــ اب اتنا نہ بناؤ مجھے" ـــــ میں خوش دِلی سے مُسکرائی۔

اب دُھوپ ڈھلنی شروع ہو گئی تھی ـــــ مسز اختر نیچے سے آوازیں دے رہی تھیں۔

ہم وہاں پہنچے، ـــــ تو چائے تیار ہو چکی تھی ـــــ اِس وقت خنکی بڑھنے لگی تھی ـــــ ایسے میں گرم چائے نے نئی تازگی بخشی ـــــ

چائے سے فراغت پانے کے بعد مسز اختر نے کہا :

" چلو تمھیں سینی ٹوریم کی سیر کرا لائیں۔"

آج وُہ ضرورت سے زیادہ مہربان نظر آتی تھیں، ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ فوراً تیار ہو گئے۔ یہاں سے ہم پیدل ہی —— سینی ٹوریم کی جانب چل پڑے، وہاں پُہنچ کر بیگم اختر نے سسٹر انچارج سے ہاسپٹل دیکھنے کی اجازت چاہی، جو کہ اُس نے بخوشی دے دی۔ بلکہ وہ ہر چیز کی تفصیلات بتانے کے لیے ہمارے ہمراہ چل پڑیں۔

یہ ایک بڑی وسیع عمارت تھی —— ایک جانب مریضوں کے وارڈ تھے —— دوسری جانب یہاں کام کرنے والوں کی رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے —— وارڈوں سے اگلی جانب گھاس کا مربع پلاٹ تھا۔ جس کے چاروں طرف پھُولوں کے پودے لگے ہوُئے تھے —— اس موسم میں بھی بعض پودے بالکل سرسبز تھے، قدرے فاصلے پر بادام، سیب، اور ذرد آلو کے پیڑ لگے ہوُئے تھے۔

سسٹر انچارج نے بتایا :

" کہ یہ تمام فروٹ بھی مریضوں کے لیے وقف ہے —— اور یہ پُورا حصّہ صرف خواتین کے لیے ہے، مردانہ حصّہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے، —— اِسی عمارت کا عقبی حصّہ اُن کے استعمال کے لیے ہے۔"

اِس کے بعد —— ہم اندر کی جانب بڑھے ، اندر کے کمرے بھی صاف —— کھُلے —— اور ہوادار تھے —— ہر کمرے میں چار بیڈ تھے۔ یہاں کے مریضوں کو ہر طرح کی سہولتیں مہیّا کی جاتی ہیں —— ایک خاتون نٹنگ کر رہی تھی —— ایک رشیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے قمیص پر لگا رہی تھی —— ایک دریچہ کھُلا تھا —— مَیں اُس طرف بڑھی —— ایک نوجوان لڑکی باہر دیکھ رہی تھی —— مَیں اُس کے قریب چلی گئی —— یہ ایک زرد رو دُبلی پتلی نوجوان لڑکی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور پتلے نقوش، —— میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا —— یہ عمر کوئی ہاسپٹل میں رہنے کی ہے ، اسے تو کسی کے گھر کی زینت بننا چاہیئے تھا —— ابھی تو اس کے گلشن میں بہار آئی تھی ، یہ کہاں خزاؤں میں بھٹکتی پھر رہی ہے ۔ یہ تو اُمنگوں کا زمانہ تھا —— لیکن نہ جانے اس کے دل میں کون کون سی تمنّائیں دم توڑتی ہوں گی —— ہائے —— یہ بیماری بھی کتنی بے رحم ہے۔

"کیا نام ہے تمھارا —— ؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"نرگس ——" وُہ دھیرے سے بولی۔

"کِسی کا انتظار کر رہی ہو کیا ؟" مَیں نے یونہی پوچھ لیا۔

"اِنتظار —— وہ کھو سی گئی —— ہاں —— واقعی انتظار ہی تو کر رہی ہُوں" ——

"کس کا ——— ؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"موت کا ———" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

"نہیں نہیں ———" میں کانپ اُٹھی ——— "ایسا نہ کہو ——— ابھی تو تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا ——— تم ٹھیک ہو جاؤ گی، اور پھر اپنے جیون ساتھی کے ساتھ محبّت بھری زندگی کا وہ پُرکیف سفر طے کرو گی، جس کا ہر ہر قدم فردوسِ حیات ہو گا ——— ابھی تو تم سے نئی کونپلیں پھوٹیں گی ——— بھولتی کیوں ہو ——— نوکیلے کانٹوں کے ساتھ خوش رنگ پھول بھی ہوتے ہیں ——— خزاں ہمیشہ تو نہیں رہتی نا ——— بہار آئے گی ——— ضرور آئے گی ——— مگر تم حوصلہ نہ ہارو ——— اگر ہماری زندگی میں دُکھ نہ ہوں، تو ہم خوشیوں کو کیسے جانیں گے، خوشیوں سے کیسے لُطف اندوز ہوں گے ——— میری دوست، دُکھ ہی تو ہماری خوشیوں کو نمایاں کرتے ہیں۔"

اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ کہنے لگی:

"ایسے خواب میں بھی دیکھا کرتی ہوں ——— کیا یہ کبھی شرمندۂ تعبیر ہوں گے ——— ؟"

"کیوں نہیں ——— لیکن تم وعدہ کرو، کہ حوصلہ نہ ہارو گی۔"

"میں کوشش کروں گی، ——— کہ مایوس نہ ہوؤں۔" وہ مسکرائی۔

دریچے کے باہر سرمئی چوٹیوں کے پیچھے سُورج ڈوب رہا تھا، آسمان پر شفق کا رنگین آنچل لہرا رہا تھا۔ اُونچے اُونچے درخت سر جھکائے

خاموش کھڑے تھے ۔۔۔۔ اور صاف ستھری سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی نشیب میں گم ہو گئی تھی۔

"بنیا ۔۔۔۔۔" مسز اختر نے آواز دی ۔۔۔۔ "لوٹ آؤ ۔۔۔۔ واپس چلیں"۔۔۔۔۔

میں نے نرگس سے ہاتھ ملایا ۔۔۔۔۔ اور بوجھل دل لیے ۔۔۔۔۔ لوٹ آئی ۔۔۔۔ تمام راستے میرے ذہن میں اُس کا خیال رہا۔ ہماری زندگی میں خوشیوں کے لمحات آخر اتنے مختصر کیوں ہوتے ہیں؟"

○

یکم مارچ ۱۹۵۵ء

کئی روز سے بخار آرہا ہے ــــــ طبیعت بہت پژمردہ سی ہے، ــــــ سارا دن سر لپیٹے لحاف میں پڑی رہتی ہوں ــــــ مسز اختر میرے لیے پریشان ہیں ــــــ بار بار آکر انھیں دوائی لینے کی تاکید کرنی پڑتی ہے، راحیلہ آج کل میرے کمرے ہی میں سوتی ہے۔ وہ بھی ہر ممکن طریقے سے مجھے خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے ــــــ آج بھی لائبریری سے میرے لیے ناول لینے گئی ہے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر تم سے دو باتیں کر لینی چاہی ہیں۔

نومی! ــــــ آج کل ممی بہت یاد آتی ہیں ــــــ جی چاہتا ہے کہ اس وقت بیماری میں وہ میرے قریب ہوتیں، اگر ایسا ہوتا ــــــ تو میں اُن کی آغوش میں سر رکھ کر کتنی راحت، کتنا سکون محسوس کرتی۔ اللہ ــــــ بیماری میں اپنے کس بُری طرح یاد آتے ہیں ــــــ اور ماں کی محبّت تو کتنی انمول شے ہے ــــــ دُنیا کی ساری دولت ــــــ ساری قوتیں ــــــ سارے جذبے بھی ماں کی محبّت کا بدل نہیں ہو سکتے

— لیکن — میں اپنی بیماری کی اطلاع ممّی کو —
نہیں دینا چاہتی — میں اُن کی — پریشانیوں میں —
اضافہ نہیں کرنا چاہتی — اس وقت بھی بخار کافی تیز ہے۔ سر
میں سخت درد ہے، اور آنکھوں میں جلن ہو رہی ہے —
اچھا — میری ہمدم! — باقی پھر سہی —

○

یکم اپریل ۱۹۵۵ء

آج کافی دنوں کے بعد طبیعت کچھ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں بخار نے اتنا طول کھینچا کہ بیگم اختر گھبرا کر ممّی کو اطلاع دینے والی تھیں۔ بڑی مشکل سے اُنھیں اِس ارادے سے باز رکھا۔ پندرہ روز کے بخار نے تحفے کے طور پر کمزوری اور نقاہت بخش دی ہے۔ جی چاہتا ہے، خاموش بستر پر پڑی رہوں —— لیکن سیمیں مُصر ہے، کہ باہر گھوموں پھروں۔ تاکہ طبیعت کچھ بحال ہو۔ اُس کے اِصرار پر میں نے لباس تبدیل کیا اور ہم کالج کی عمارت کی طرف چل پڑے۔

آج کل یہاں خوب رونق ہے، نئی نئی صورتیں نظر آرہی ہیں۔ ہنستے مسکراتے چہرے — رنگین آنچل — ہر طرف لہرا رہے ہیں۔ نئی آنے والی لڑکیاں کچھ گھبرائی، کچھ جھینپی سی پھر رہی ہیں۔

درختوں کے اُس جھنڈ میں تھرڈ ایئر کی دو تین لڑکیاں دو اجنبی لڑکیوں کو گھیرے اُن کا اِنٹرویو لے رہی ہیں، اور لڑکیاں عجیب سوالات کا جواب اور زیادہ بوکھلا کر دے رہی ہیں۔ گھبراہٹ اور پریشانی اُن کے چہروں سے مترشح تھی۔ ہم نے جا کر اُن لڑکیوں سے اُن کی جان چھڑائی۔

آنے والی، نئی لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کچھ کالج کی روایت ہی بن چکی ہے، اور پھر یاد آیا، آج فسٹ اپریل ہے —— جو کچھ بھی یہ لڑکیاں کریں، کم ہے۔

کچھ آگے بڑھے، تو دیکھا راحیلہ کچھ لڑکیوں کو پان پیش کر رہی تھی۔ راحیلہ اور اتنی فراخ دلی۔ کچھ تعجب سا ہوا —— لیکن ابھی ہم پورے طور پر حیران بھی نہ ہونے پائے تھے، کہ پان کھانے والے چہرے بگڑے نظر آئے، اور باچھوں اور لبوں پر سُرخ رنگ پھیلنے لگا، وہ لوگ باتھ رُوم کی طرف بھاگیں، اور راحیلہ آنچل میں مُنہ چھپا کر ہنسنے لگی —— معلوم ہُوا کہ پان میں سُرخ سیاہی کتھے کی جگہ رکھی گئی تھی۔

جو لڑکیاں اپنے گھروں میں چھٹیاں گزارنے گئی تھیں، —— وُہ لوٹ آئی ہیں ——

بارہ بجے تک ہم اُن سے ملتے رہے۔ واقعی سیمیں کا خیال درست تھا، مَیں اب اپنے آپ کو پہلے سے بہتر پاتی ہُوں۔

○

۱۵- اپریل ۱۹۵۵ء

بہار کی آمد آمد ہے ـــــ درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، اور یہاں کی زندگی اپنے معمول پر آگئی ہے۔ آج بیگم اختر کلاس میں آئیں۔ تو کہنے لگیں:

"آج کی میٹنگ میں مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کی امداد کے لیے کچھ رقم بھیجنے کی تجاویز زیرِ غور تھیں ـــ اگر آپ لوگ تعاون کریں۔ تو ہم ٹیلی ویژن پروگرام میں حصّہ لیں، اور پھر وہ رقم امدادی فنڈ میں جمع کرا دی جائے۔"

چند ایک لڑکیوں کو چھوڑ کر (جو کہ پردے کی سختی سے پابند تھیں) سب نے اس تجویز کو پسند کیا۔

اور اس شام ہم پہلی بار ٹیلی ویژن کی عمارت میں داخل ہوئے شہر سے دو میل دُور ـــ قدرے غیر آباد علاقے میں ـــ یہ عمارت واقع ہوئی ہے۔ یہ اندر سے بھی کافی کُشادہ تھی۔ عمارت کی اندرونی طرف مختلف قسم کے پھولوں کے پودے عجب بہار دکھا رہے تھے ـــ دائیں جانب گھاس کا ـــ

خوبصورت سا پلاٹ تھا۔ جس کے گرد گلاب کے پودوں کی باڑھ سی بنی ہوئی تھی ——— کہیں کہیں زرد اور سُرخ گلاب ہرے ہرے پتّوں سے جھانک رہے تھے۔

گیٹ کا چوکیدار گائیڈ بن کر ہمارے ساتھ اندر گیا ——— اور ہمیں ——— ایک کمرے میں کچھ دیر ——— انتظار کرنے کے لیے کہہ کر واپس مُڑ گیا۔

کمرہ بہت صاف سُتھرا تھا ——— دیواروں پر سبز رنگ تھا۔ اور ترتیب وار ایک جانب جناب قائد اعظمؒ ——— اور علامہ اقبالؒ کی خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں۔

ابھی ہم کمرے کا جائزہ ہی لے رہے تھے، ——— کہ دروازہ کھُلا، ——— اور سُرمئی سُوٹ میں ملبوس ایک صاحب اندر داخل ہوئے (اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہُوا ——— کہ یہ ڈرامہ سیکشن کے پروگرام پروڈیوسر تھے)، اُنھوں نے ہمیں ڈرامہ کا اسکرپٹ دیا، اور ہم نے آج صرف ریہرسل کی۔

ریہرسل کے بعد شہاب صاحب (پروگرام پروڈیوسر) نے ہمیں اسٹوڈیو دیکھنے کی دعوت دی۔

اُن کے ہمراہ ہم اسٹوڈیو کی جانب چل پڑے، اسی عمارت کے مغربی حصّے میں دو کمروں پر مشتمل ٹیلی ویژن سٹوڈیو ہے۔ ایک کمرے کے تین اطراف شیشے کی دیواریں تھیں، اور سائیڈ میں

میک اَپ رُوم تھا۔ ایک ہال کمرے میں بڑے بڑے کیمرے پہیّوں والے اسٹینڈ میں نصب تھے۔

ہم حیرت اور مسرّت کے مِلے جُلے احساس کے ساتھ ایک ایک چیز کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ دروازے کے قریب کھڑے ہوئے ایک خوبرو نوجوان پر پڑی۔ پل بھر کے لیے مَیں کھو سی گئی، دراز قد —— بھرا بھرا جسم —— مضبوط بازو —— کتابی چہرہ —— سنہری رنگت —— موٹی موٹی سیاہ آنکھیں —— گلابی ہونٹ، اور گھنے سیاہ بال، جن میں سے کچھ خم کھا کر ماتھے پر بکھر گئے تھے۔ گرے رنگ کے سوُٹ میں وہ مردانہ حُسن کا شاہکار معلوم ہو رہا تھا —— اور شیشے کی اِن دیواروں کے اندر وہ اپالو کے مجسّمے کی مانند پُروقار انداز میں کھڑا تھا۔

شہاب کی نظر اُس پر پڑی —— تو انھوں نے تعارف کی رسم ادا کی :

”یہ احمر ہیں۔ ہمارے ذہین ساتھی۔“

وُہ سر خم کر کے ہلکے سے مسکرا دیئے، اور مجھے یوں لگا —— جیسے مَیں انھیں مدتوں سے جانتی ہُوں۔ کچھ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو برسوں ہمارے لاشعور میں چھُپی رہتی ہیں، اور جب وہ ہمارے سامنے آتی ہیں۔ تو ایسا لگتا ہے، جیسے ہم ان سے مُدتوں سے واقف ہوں۔ مجھے یاد آیا، کہ میرا آئیڈیل اگر انسانی شکل

اختیار کرتا ــــ تو بالکل احمر کی مانند ہوتا ــــ

شہاب کی آواز سُن کر میں چونکی، وُہ کیا بتا رہے تھے، میں سمجھ نہ سکی۔ اُس کے بعد ہم سٹوڈیو سے ملحقہ کمرے میں گئے، جس کا راستہ سٹوڈیو کے اندر بنے ہوئے دروازے سے ہو کر گیا تھا ــــ یہ کمرہ میک اَپ رُوم تھا ــــ یہاں فن کار ڈرامے سے پہلے تیاری کرتے تھے۔

دن کے دو بج رہے تھے، اس لیے ہم نے شہاب سے اجازت چاہی، اور ہوسٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

○

۱۶- اپریل ۱۹۵۵ء

رات بہت دیر تک نیند نہیں آئی ـــــ میری روم میٹ تو دس بجے سے ہی خرّاٹے لینے لگی تھی۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے جیسے رُوٹھ گئی تھی ـــــ کتنی ہی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ بار بار احمر کا پیکر میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا، اور میں غیر شعوری طور پر ان کے بارے میں سوچنے لگتی۔

میں پہلی نظر میں محبّت ہونے کی قائل کبھی بھی نہ تھی ـــــ لیکن آج مجھے اپنے ہی نظریات مضحکہ اُڑاتے محسوس ہو رہے تھے، یہ پہلا موقع تھا، کہ کسی مرد کے حُسن سے میں اس طرح متاثر ہوئی تھی۔ واقعی وہ بہت خوبصورت تھے ـــــ وہ ان کے بات کرنے کا دھیما دھیما انداز ـــــ وُہ دل کش مسکراہٹ ـــــ میں اُن کی ـــــ کسی چھوٹی سی حرکت کو بھی ـــــ نظر انداز نہ کر سکی تھی۔

کبھی کوئی یُوں بھی پسند آ جائے گا ـــــ اس بارے میں تو مَیں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا ـــــ نہ جانے احمر میں کیا بات تھی۔

ورنہ مجھے تو مردوں کے نام سے ہی نفرت تھی۔

پاپا نے ممّی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا ـــــ میرا ذہن اسے کبھی بھی فراموش نہ کر سکا تھا ـــــ میری نظر میں آج تک مرد ایک ظالم اور جابر کے سوا کچھ نہ تھا ـــــ جو کمزور عورت پر ہر لمحہ حاوی ہونے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے ـــــ جسے عورت کے جذبات و احساسات کا کوئی خیال نہیں ہوتا ـــــ جس کی نظر میں عورت ایک حقیر کھلونا ہوتی ہے ـــــ اور بس!

لیکن ـــــ احمر کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ان باتوں کا خیال نہ آیا ـــــ اب ضروری تو نہیں ـــــ کہ ہر مرد پاپا جیسا ہی ہو ـــــ وہ کتنے مہربان نظر آتے تھے، نہیں نہیں ـــــ میں ان کے بارے میں کسی غلط خیال کو اپنے دل میں جگہ نہیں دوں گی!

میرا ذہن ـــــ پریشان ہو رہا تھا ـــــ میں نے دھیان بٹانے کو ناول اٹھایا ـــــ اور پڑھنے لگی ـــــ پورا صفحہ پڑھ ڈالا، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا ـــــ بے دلی سے واپس میز پر رکھ دیا ـــــ اور دریچے میں آکھڑی ہوئی ـــــ باہر رات تاریک تھی۔ ہوا میں رات کی رانی کی مہک رچی ہوئی تھی ـــــ ہوسٹل پر سناٹا چھایا ہوا تھا ـــــ سب لوگ آرام کر رہے تھے ـــــ لیکن یہ کیسی بے کلی تھی۔ جو مجھے چین نہ

لینے دے رہی تھی ـــــ یہ کیسی مدھم مدھم سی آنچ تھی، جو مجھے پگھلائے دیتی تھی۔

کتنی ہی دیر تک میں ٹہلتی رہی ـــــ

میں اپنے آپ کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ رات کے پچھلے پہر کہیں جا کر آنکھ لگی ـــــ اور کچھ دیر کے لیے میں نے اس پریشان خیالی سے نجات پائی۔

○

۱۷- اپریل ۱۹۵۵ء

شاید اُس وقت نو بج رہے تھے —— جب راحیلہ نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔

مَیں نے کسلمندی سے آنکھیں نیم وا کیں:

"کیا بات ہے؟"

"کیا آج سوتی رہو گی۔ دیکھو تو کیا وقت ہوگیا ہے۔" اُس نے اپنی رسٹ واچ دکھاتے ہوئے کہا۔ "نو بج رہے ہیں۔"

"کیا —— واقعی ——؟" مَیں گھبرا کر جلدی سے اُٹھ بیٹھی۔

"جی نہیں —— مَیں تو دل لگی کر رہی ہُوں —— ایک پیریڈ گزر گیا ہے، —— اور محترمہ کو ابھی تک پو پھٹنے کا یقین نہیں آ رہا۔

"اوہ ——" مَیں کچھ نہ بول سکی۔

"کیوں کیا بات ہے؟ رات بھر وظیفہ کرتی رہی ہو کیا؟" اُس نے میری سُوجی سُوجی آنکھوں کو دیکھ کر پُوچھا۔

" نہیں ——— رات میری طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی - اچھی طرح سو نہ سکی "۔

" کیوں — کیا ہو گیا تھا — شام کو تو تم اچھی بھلی تھیں " ——— وُہ کُرید نے لگی۔

" اوہ ——— تم تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہو — راحیلہ ! اب بیمار ہونے کا بھی کوئی وقت مقرر ہے کیا ؟ " مَیں جھنجھلا سی گئی ۔

" واقعی ——— تمھاری طبیعت خراب ہے - اب یقین آ گیا ہے۔ ورنہ یُوں صُبح صُبح تمھارا مُوڈ اِس خطرناک حد تک خراب کبھی نہیں ہُوا — اچھا — چلو، تم منہ ہاتھ دھو لو ——— اور مَیں تمھارے لیے چائے بنائے دیتی ہُوں ——— سب لڑکیاں ناشتے سے فارغ ہو چکی ہیں — اور خانساماں دوپہر کے لیے سودا لینے بازار جا چکا ہے - کچن میں اس وقت کوئی بھی نہیں — چلو ——— اب دیر نہ کرو "۔

مَیں نے تولیہ اٹھایا ، اور باتھ رُوم کی طرف بڑھی ——— لباس تبدیل کرنے کے بعد جب ڈائننگ ہال میں پہنچی ——— تو وہاں راحیلہ کے سوا کوئی بھی نہ تھا ——— مَیں نے کُرسی کھینچی اور خاموشی سے بیٹھ گئی ——— راحیلہ میرا کتنا خیال رکھتی ہے ——— اور ایک مَیں ہُوں کہ ——— مجھے اپنے صبح والے رویّے پہ افسوس ہونے لگا — !

" کیا سوچ رہی ہو بٹیا ——— چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے "۔

راحیلہ کی آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔

"راحیلہ —— تم مجھ سے خفا تو نہیں" —— میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ارے —— چھوڑو بھی —— کیا فضول باتیں لے بیٹھی ہو میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بُرا نہیں مانتی —— اچھا —— اب سب کچھ بھول کر —— اچھے بچوں کی طرح چائے پیو" —— وہ مسکرائی۔

ہم نے چائے پی —— اور باہر نکلے —— تو دیکھا، —مسز اختر لڑکیوں کو لے جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں —— ہم بھی اُن میں شامل ہو گئے —— اور جیپ نے ہمیں جلد ہی ٹیلی ویژن کی عمارت تک پہنچا دیا۔

○

۱۸- اپریل ۱۹۵۵ء

سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے —— مجھے اچانک خیال آیا —— احمر بھی یہیں ہوں گے —— اور ممکن ہے، اُن سے مُلاقات بھی ہو جائے —— اِس احساس کے ساتھ ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔

جب ہم کمرے میں پہنچے —— تو شہاب ہمارے منتظر تھے —— رسمی سی باتوں کے بعد اُنھوں نے ڈرامے کی کاپیاں منگوائیں۔ اور سب میں تقسیم کر دیں —— ہم لوگ اُسے پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

دروازے کے قریب آہٹ ہُوئی۔ مَیں نے نگاہیں اُٹھائیں۔ وہ دروازے میں کھڑے تھے —— پَل بھر کے لیے اُنھوں نے میری آنکھوں میں جھانکا —— نہ جانے اُن کی آنکھوں میں کیسی کشش تھی، کہ مَیں زیادہ دیر تک اُن کی طرف دیکھ بھی نہ سکی۔ میری پلکیں جُھک گئیں۔

وُہ پُر وقار انداز میں چلتے ہوئے کمرے میں آ گئے —— اور شہاب کے قریب ہی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"احمر —— تمھیں اس ڈرامے میں ہیرو کا کردار ادا کرنا ہے۔ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" شہاب نے اُن سے پوچھا۔

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" وُہ مُسکرائے۔

مَیں تو اُن کی قُربت کے احساس سے ہی گھبرا رہی تھی —— اور یہ سُن کر کہ اب اُن کے ساتھ کام کرنا ہوگا —— مجھے اپنے ہوش و حواس رُخصت ہوتے محسُوس ہونے لگے۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے —— آخر اور لڑکیاں بھی تو ہیں —— مَیں نے اپنے آپ کو تسلّی دینے کی کوشش کی —— مجھے محتاط رہنا چاہیئے —— ورنہ مسز اختر کیا سوچیں گی —— نہیں —— مَیں ہرگز بدحواسی کا مظاہرہ نہ کروں گی —— مَیں نے سوچا۔

شہاب نے ڈرامے کی ریہرسل شروع کروائی —— تو اس کا انکشاف ہُوا، کہ وُہ ایک اچھے اداکار بھی ہیں۔ صاف، واضح اور نکھری ہُوئی آواز —— وُہ اپنے کردار میں ڈوب کر بول رہے تھے اور خصُوصاً رُومانی سین میں —— اُن کی آواز اِتنی جذباتی ہو گئی تھی، کہ مَیں جھجک کر خاموش ہو گئی۔ اب یہ بھی عجیب اتفاق تھا، کہ ہیروئین کا کردار مجھے ادا کرنا تھا۔ اور وہ بھی کس کے ساتھ —— احمر کے ساتھ ——

مجھے یُوں خاموش دیکھ کر مسز اختر کہنے لگیں :

"ارے، اِتنا شرما کیوں رہی ہو۔ آج تو تمھارے مقابل ایک

منجھا ہُوا اداکار ہے۔ اگر یُوں ہی شرماتی رہیں — تو اس سے مات کھا جاؤ گی۔"

میری نگاہیں غیر ارادی طور پر اُٹھیں۔ وُہ بھی میری جانب ہی دیکھ رہے تھے۔ متوجہ پاکر بولے:

"آپ کی آواز تو بہت اچھی ہے۔ بس ذرا گھبرا رہی ہیں آپ — چلیے پھر کوشش کیجیے — آپ یقیناً" کامیاب ہوں گی۔"

مَیں کوئی جواب نہ دے سکی۔ لیکن اُن کے الفاظ نے میری ڈھارس بندھائی۔ تقریباً ایک گھنٹہ ہم لوگ ریہرسل میں مصرُوف رہے۔ اُس سے فارغ ہُوئے، تو شہاب نے چائے منگوائی۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا، کہ دو روز بعد یہ کھیل ٹیلی ویژن پر پیش کیا جائے گا۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد، اُن کی گاڑی ہمیں ہوسٹل کی جانب لے کر روانہ ہو گئی۔

○

۱۹- اپریل ۱۹۵۵ء

یہ دو روز کسی سُہانے خواب کی مانند بیت گئے ـــــ صبح ہوتے ہی ہم لوگ دو پیریڈ اٹنڈ کرتے ـــــ اور اس کے بعد بیگم اختر کے ساتھ اسٹوڈیو پہنچ جاتے ۔ دو تین گھنٹے ریہرسل ہوتی، ـــــ کچھ وقت یُوں ہی تبادلۂ خیالات ہوتا ـــــ اور دو بجے تک ہم واپس ہوسٹل آجاتے ـــــ جتنا وقت میں وہاں رہتی، احمر کی دل کش شخصیّت میں کھوئی رہتی ـــــ کتنے خوش لباس ـــــ کتنے خوش گفتار تھے وہ ـــــ چہرے پر ہر وقت ایک دل کش مسکراہٹ رقصاں رہتی ۔ بات کرتے ـــــ تو ایسے لطیف مذاح کا پہلو لیے ہوئے ـــــ کہ ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ـــــ سب لوگ انھیں پسند کرتے تھے ۔ میری تو بات ہی اور تھی ـــــ چُپکے چُپکے وُہ میری پُوری ہستی پہ چھا گئے تھے ـــــ اُن کی ہر حرکت ـــــ ہر بات، ـــــ میرے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی تھی ـــــ مجھے ایسا لگتا ـــــ جیسے وہ میرے جنم جنم کے ساتھی ہوں۔

آخر وُہ رات آگئی ـــــ شام ڈھلتے ہی ہم نے تیار

ہونا شروع کیا۔ میں نے سفید ساڑھی پہنی، اور جوڑے میں سفید چنبیلی کے پھول سجائے —— آٹھ بجے ہم اسٹوڈیو پہنچ گئے —— شہاب اور احمر ہمارا انتظار کر رہے تھے —— احمر نے سیاہ سوٹ پہنا تھا۔ جس میں وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آ رہے تھے۔ پل بھر کے لیے انھوں نے میری طرف دیکھا۔ اُن کی نگاہوں سے پسندیدگی جھلکی۔ وہ زیرِ لب مسکرائے —— اور میری پلکیں خود بخود جھک گئیں۔

ساڑھے آٹھ بجے ڈرامہ شروع ہوا ——

میں نے اعتماد سے اپنا کردار ادا کیا —— اُن کے ساتھ کام کرتے ہوئے آج میں ذرا نہ جھجکی —— الفاظ خود بخود میرے ہونٹوں سے پھسل جاتے۔ کچھ عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری تھی —— شاید یہ اُن کی قربت کا نشہ تھا۔

ڈرامہ ختم ہوا —— میں میک اَپ رُوم میں آئی۔ تو بیگم اختر نے مجھے گلے سے لگایا:

"ارے —— کمال کر دیا تم نے۔ میں تو یُونہی گھبرا رہی تھی —— بِٹیا —— تمھارا چہرہ سکرین پر اتنا پیارا لگ رہا تھا، کہ بیان نہیں کر سکتی اور ایکٹنگ تو لاجواب تھی —— مجھے تو یقین نہیں آ رہا تھا —— کہ یہ وہی دور وز پہلے والی بِٹیا ہے۔ جو ذرا ذرا سی بات پر آنچل میں مُنہ چھپا لیا کرتی تھی —— ارے، تم تو چھُپی رُستم نکلیں۔

میں ہنس دی —— میرے جی میں آیا —— کہ اُن سے کہوں ——

یہ میرا نہیں —— احمر کے قرب کا کمال ہے۔ مجھے تو خبر نہیں —— میں نے کیا کہا تھا —— کیسے کہا تھا —— مجھے تو صرف ایک بات یاد ہے احمر میرے سامنے ہیں، اور بس ——

ابھی لڑکیاں مجھے مبارک باد ہی دے رہی تھیں، کہ احمر اور شہاب بھی وہاں آگئے ——

"ویری نائس — مس بلیا" —— احمر کی مسرّت میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری —— "آپ نے بہترین اداکاری کی ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا، کہ اس ڈرامے کی کامیابی کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔"

میں نے ایک ثانیے کے لیے غور سے اُن کی جانب دیکھا، —— فرطِ مسرّت سے ان کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا —— خوشی اُن کے انگ انگ سے پھُوٹی پڑتی تھی —— ایک فن کار کے پاس اپنے فن کے علاوہ اور ہوتا ہی کیا ہے —— اور پھر اس موقعے پر جب کہ فن کار کے فن کے لوگ مداح ہوں، تو پھر اُس کی خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔

اُن کے الفاظ سُن کر —— میری رُوح فرطِ مسرّت سے جھُوم اُٹھی —— احمر نے میری تعریف کی تھی —— میرے فن کو سراہا تھا —— میں جتنا بھی —— اپنی قسمت پر ناز کرتی کم تھا۔

"احمر صاحب! —— یہ سب آپ کی توجہ اور محنت کے طفیل تھا۔

ورنہ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا ـــــــ اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ـــــــ آپ جیسے فن کار کے ساتھ کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔" میں نے کہا۔

"اُونھوں ـــــــ اب آپ انکساری سے کام لے رہی ہیں۔" وُہ خوش دلی سے ہنسے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ اس لیے ہم واپس جانے کے لیے تیاری کرنے لگے۔

○

۲۰- اپریل ۱۹۵۵ء

آج دن بھر لڑکیوں کی زبان پر کل کے ڈرامے کا تذکرہ رہا۔ احمر کی اداکاری کی تعریف تقریباً سب ہی نے کی —— اُن کی تعریف سُن کر مجھے اتنی خوشی ہُوئی —— کہ اگر کوئی میری تعریف کرتا تو شاید اتنا خوش نہ ہوتی —— میری پسند ایسی ہے، جسے سب پسند کرتے ہیں —— یہ سوچ کر مجھے اتنی مسرّت ہوتی ہے جسے میں بیان نہیں کرسکتی۔

تاہم ایک خیال ایسا تھا۔ جو مجھے پریشان کیے دیتا تھا۔ وہ یہ کہ —— اب ہمارا کام ختم ہوچکا تھا، اور فی الحال کوئی ایسی صورت نظر نہ آتی تھی —— کہ اسٹوڈیو جایا جائے اور وہاں نہ جانے کی صُورت میں احمر سے ملنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ تو کیا —— اب میں کبھی ان سے نہ مِل سکوں گی۔ اس اندیشے کے ساتھ ہی میرے دل میں اُداسی کا بے ذائقہ تیزاب پھیل گیا۔ آنکھوں کے آگے دُھندسی لہرانے لگی۔ میں لڑکیوں کو باتوں میں مصروف پاکر چپکے سے وہاں سے چل دی، اور عقب کی جانب سیڑھیوں، برآمدوں

کے باغ کی راہ لی۔ یہ باغ کالج کی عمارت کی پُشت پر واقع ہے۔ یہاں بادام اور سیبُ کے درخت قطار در قطار لگے ہیں۔ درختوں میں لاتعداد ہلکے گلابی اور سفید پھول کھِلے تھے۔ زمین پر سبز گھاس کے کامخملیں فرش بچھا تھا، اور اُس کے چاروں طرف نرگس کے پودے لگے ہوئے تھے۔ جن میں کہیں کہیں نرگس کے سفید پھُول محوِ انتظار تھے میں وہیں درختوں کے کنج میں بیٹھ گئی —— بے خیالی میں میں نے نرگس کے پھُول کو چھُوا —— وہ پھول یوُں نیم وا تھا۔ جیسے صبح کی شبنم نے اُس کی تشنگی نہ بجھائی ہو۔

احمر کا خیال میرے ذہن پر بُری طرح چھایا ہُوا تھا۔ مَیں نے سوچا، اُن کے بِنا میرا حال بھی اس پیاسے پھُول کی مانند ہے۔ جس پر کبھی اوس نہ گری ہو۔

لیکن —— کیا —— کبھی وہ بھی یہ سوچتے ہوں گے، محسُوس کرتے ہوں گے —— مَیں اس سے کتنی بے خبر تھی۔ اُنھوں نے کبھی اظہار بھی تو نہیں کیا تھا —— پھر بھلا مَیں کیسے جان سکتی تھی۔ ہاں، البتہ جب وہ میری طرف دیکھتے تھے، تو مجھے یوُں محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ خوبصورت آنکھیں مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں —— اور یہ چھُپی نگاہیں دل میں اُتر کر وہ کسک بخشتی تھیں۔ جن کی مٹھاس کبھی بھُلائی نہ جا سکے۔

میرے ذہن میں وہ سنہری دن ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ جو مَیں نے اُن کے ساتھ گزارے ہیں۔ میری یادوں کے سمندر میں وُہ دن روشنی

کے مینار کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے گا ـــــ اور میرے ذہن کو راہ سجھاتا رہے گا۔

اُن کی یاد میرے دل میں یوں تیر رہی تھی۔ جیسے پانی کی سطح پر کنول کا پھول ہوا کے جھونکوں سے رقص کرنے لگے۔

اُس محبوب ہستی کا قرب۔ اُن کی مسحور کن نگاہوں کا طلسم مسکراہٹوں کی لطافت شاید ہی کبھی فراموش نہ کر سکوں۔

زندگی کے چند لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو کبھی نہیں بھولتے۔ جن کا دل پر اتنا گہرا نقش ہوتا ہے، کہ کبھی نہیں مٹ سکتا ـــــ اِس کا احساس تو مجھے اب ہُوا تھا۔

○

۲۷-اپریل ۱۹۵۵ء

ایک ہفتہ گزر گیا ـــــ احمر سے ملے بغیر ـــــ اُن کو دیکھے بنا ـــــ لیکن اِن سات دنوں کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا ـــــ جب مجھے اُن کا خیال نہ آیا ہو ـــــ جی کسی کام میں نہیں لگتا، ـــــ یُوں لگتا ہے ـــــ جیسے کوئی بُہت قیمتی چیز ـــــ کھو گئی ہو ـــــ

ہر رات جب بستر پر لیٹتی ہُوں ـــــ تو ذہن اُن کی یاد سے معمُور ہوتا ہے ـــــ آنکھیں بند کرتی ہُوں ـــــ تو اپنی اُسی سحرانگیز شخصیّت کے ساتھ وُہ لبوں پہ ہلکا سا تبسّم لیے آموجود ہوتے ہیں۔

صبح جب آنکھیں کھولتی ہُوں ـــــ تو لبوں پر اُن کا نام ہوتا ہے۔ کیا وُہ بھی مجھے یاد کرتے ہوں گے؟ اس تصوّر کے ساتھ عجیب سی تسکین وابستہ ہے۔ کاش ـــــ کوئی بتا سکتا! کیا اُنھیں بھی میرا خیال آتا ہوگا؟ ـــــ کیا سوچتے ہوں گے وہ میرے بارے میں؟ نہ جانے ایسے کتنے ہی سوالات میرے

ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ :

ع بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہُوئے

ہر لمحے تنہائی کی متلاشی رہتی ہوں۔ ہنگامے تو پہلے بھی پسند نہ تھے، اب تو اور بھی آدم بیزار ہو گئی ہُوں۔

راحیلہ اور سیمیں زبردستی اپنے کمرے میں لے جاتی ہیں۔ محفل جمتی ہے، لطیفے سنائے جاتے ہیں، ریکارڈ بجتے ہیں — اور کبھی کبھی جب وہ مُوڈ میں ہوں۔ تو ٹوِسٹ کیا جاتا ہے۔

لیکن میرا دل نہیں بہلتا — باتیں کرتے کرتے کھو سی جاتی ہوں۔ اور جب وہ کچھ پوچھتی ہیں، تو بوکھلا کر — بے تُکے جواب دینے لگتی ہُوں!

وہ لوگ خوب ہنستی ہیں۔ کہتی ہیں :

"ہماری بلیا کو تو کسی الف لیلہ کے سے ماحول میں رہنا چاہیئے تھا — راہ بھول کر کالج کے ہوسٹل میں آ گئی ہے! — کیا سوچتی رہتی ہو تم ......"

اب مَیں اُنھیں کیا بتاؤں — کہ مَیں اپنے شہزادے کے بارے میں سوچتی رہتی ہُوں — اپنا شہزادہ — اللہ — کتنا کیف۔ کتنا سرور ہے اِس لفظ "اپنا" میں۔ کاش وہ میرے بن جائیں — تب مَیں بے جھجک سب سے کہہ سکوُں۔ سب کو بتا سکوُں — کہ یہی ہے وُہ — جس نے میری آنکھوں کو جاگتے

میں خواب دیکھنے سکھائے۔ جس نے میرے دل کو دھڑکنے کا نیا انداز سکھایا ـــــ یہ انتظار ـــــ یہ بے تابی ـــــ یہ خلش ـــــ یہ بے کلی ـــــ جینے کا اِک انداز یہ بھی تو ہے۔ اِن احساسات سے میرا ذہن اب تک نا آشنا تھا۔ کیسے نئے نئے جذبات سے میں آگاہ ہوتی جا رہی ہُوں ـــــ زندگی کے کتنے ہی پُر اسرار رمُوز رفتہ رفتہ مجھ پر کُھلتے جا رہے ہیں ـــــ اور یہ سب، کتنا عجیب، کتنا انوکھا، کتنا نیا لگتا ہے۔

○

یکم مئی ۱۹۵۵ء

یوں لگتا ہے۔ جیسے صدیاں گزر گئی ہیں، احمر کو دیکھے ہوئے، ہر دن ایک برس جتنا طویل ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، ان کی یاد —— ان کا خیال —— میرے دل کی گہرائیوں میں اور زیادہ جاگزیں ہوتا جا رہا ہے —— یوں جیسے —— نیلگوں سمندر کی تہہ میں خوبصورت موتی چھپے ہوتے ہیں، یا جیسے گلاب کی جڑوں کے آس پاس والی خاک میں —— گلاب کی مہک رچی ہوتی ہے۔

"آج اتوار ہے۔" راحیلہ کہنے لگی —— "مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں، میرے ساتھ بازار چلو۔"

مجھے بھی اپنی ضروریات کی چند چیزیں خریدنی تھیں۔ اس لیے میں اُس کے ہمراہ بازار چلی گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک شاپنگ میں مصروف رہے۔ میں نے سوچا، اب بازار آئے ہی ہیں، تو نقوش کا تازہ پرچہ بھی خرید لوں۔ ہم لوگ گوشۂ راحت کی جانب بڑھے۔ راحیلہ اپنی پسند کی کتابیں

دیکھنے لگی، اور میں نے نقوش طلب کیا۔ ابھی دکان دار نکال کر دے ہی رہا تھا، کہ پُشت کی جانب سے کسی نے پوچھا:

"کیا نقوش کا تازہ پرچہ آگیا ہے؟"

آواز جانی پہچانی سی لگی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا، تو احمر کھڑے تھے چند لمحوں کے لیے میری قوّتِ گویائی سلب ہو گئی۔ بالکل خلافِ توقع وُہ میرے اِتنے قریب کھڑے تھے، کہ مجھے اُن کی موجُودگی کا اب تک یقین نہ آ رہا تھا۔ اُنھوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ایک شگفتہ مُسکراہٹ اُن کے لبوں سے کھیلی:

"ہلو مِس بینا، کیسے مزاج ہیں؟" وہ گرمجوشی سے بولے۔

"دُعا ہے آپ کی!" مَیں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہُوئے کہا۔ راحیلہ بھی قریب آ گئی۔ میں نے اُس کا تعارف کرایا:

"یہ راحیلہ ہیں، میری دوست!"

"اور ــــ انھیں تو تم جانتی ہی ہو گی۔"

"انھیں بھلا کون نہ جانتا ہو گا۔" راحیلہ نے شوخی سے کہا۔

"بڑی مسرّت ہُوئی آپ سے یُوں اچانک مل کر۔"

"اور مجھے بھی۔" وہ سر خم کر کے بولے۔

دکاندار نے ہمارے مطلوبہ پرچے ہمیں دیئے۔ میں نے بل ادا کیا، اور باہر نِکل آئے۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں، تو مَیں آپ کو آئس کریم کی دعوت دینے کی

جسارت کروں!" احمر نے راحیلہ کی جانب دیکھ کر کہا۔

"کیوں زحمت کرتے ہیں آپ!" مَیں نے رسماً کہا۔

"زحمت نہ کہیے۔ مَیں اِسے اپنی خوش نصیبی تصوّر کروں گا۔ اگر آپ کُچھ وقت میرے ساتھ گزارنا پسند کریں۔"

مَیں نے اجازت طلب نظروں سے راحیلہ کی جانب دیکھا ——— وُہ مسکرائی۔

"جیسے تم پسند کرو ——— ابھی ہم ایک گھنٹہ اور ہوسٹل سے باہر رہ سکتے ہیں۔" وہ رسٹ واچ دیکھ کر بولی۔

احمر نے سامنے سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی رُکی! مَیں راحیلہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور احمر نے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہُوئے ڈرائیور کو شیزان چلنے کو کہا۔

○

ٹیکسی چلی، تو مجھے خود اپنے رویّے پر حیرت ہونے لگی۔ مَیں نے کتنی آسانی سے ان کی دعوت قبول کر لی تھی، حالانکہ اس سے پہلے کبھی ایسا کوئی موقع نہ آیا تھا۔

آج جب ——— اچانک وُہ ملے، تو مَیں لاشعُوری طور پہ اُن کے

قرب کی تمنّا کرنے لگی تھی، اور یہ اُسی شدید خواہش کا ردِّ عمل تھا، کہ میں اُن کی دعوت کو رد نہ کر سکی تھی! جانے پھر کب وہ ملیں، ایسے موقعے زندگی میں بہت کم نصیب ہوتے ہیں، اور میں یہ وقت گنوانا نہ چاہتی تھی۔ ٹیکسی رُکی تو میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

اُنھوں نے میٹر دیکھ کر پیسے دیئے، اور ہم لوگ شیزان میں داخل ہوئے، شہر کے نسبتاً کم آباد علاقے میں یہ ریسٹورنٹ تھا۔ اُحمر نے فیملی رُوم کھلوایا، اور ہم بیٹھ گئے، اُنھوں نے بَیرے کو آئس کریم لانے کا آرڈر دیا

بَیرا چلا گیا، تو وُہ راحیلہ سے مخاطب ہُوئے:

"آج کیسے، بازار آنے کی اجازت مل گئی آپ کو؟"

"ہمیں ہر اتوار کو اپنے عزیزوں کے گھر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ لیکن چونکہ ہمارا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں ہے۔ اس لیے ہم کبھی کبھی بازار یا پکچر چلے جاتے ہیں۔"

"اور کیا شُغل ہیں آپ لوگوں کے؟"

ہمارے شُغل کیا ہوں گے —— کبھی کبھار پکچر دیکھ لیتے ہیں، —— یا پھر ناول پڑھنے میں وقت گزارنے کی کوشش کرتے ہیں، —— ہماری زندگی —— ہمارے شَغل —— سب ہوسٹل اور کالج کی چار دیواری تک محدُود ہیں۔" وہ تناگی لہجے میں بولی۔

"اوہو! ہوسٹل سے بہت ناراض معلوم ہوتی ہیں آپ۔" وہ ہنسے "کیا، دل نہیں لگتا؟"

"بالکل نہیں، میرا بس چلے، تو ایک روز بھی یہاں نہ رہوں۔ یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے —— سب سے الگ تھلگ، سچ پوچھیے تو میں پاپا کے ڈر کے مارے یہاں رہتی ہوں، ورنہ کب کی واپس چلی گئی ہوتی۔ پاپا کا ہر سال تبادلہ ہوتا رہتا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ اس طرح تعلیم میں حرج ہوتا ہے۔ اس لیے ہوسٹل میں رہو!"

"ٹھیک کہتے ہیں وہ —— تعلیم تو ہم سب کے لیے بے حد ضروری ہے، —— اور آپ بھی یقیناً اس کی اہمیّت کو محسوس کرتی ہوں گی۔"

"ہاں —— یہ تو ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"مس بینا —— آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟ کچھ کہیے نا۔" وہ مجھ سے مخاطب تھے۔

میں نے نگاہیں اُٹھائیں —— وہ مخمور نگاہوں کی سحر انگیز کشش —— وُہی ہونٹوں پر دل کش مسکراہٹ —— میں موم کی مانند پگھلنے لگی —— اُف، —— یہ کیسی آگ ہے —— یہ کیسی مقناطیسی کشش ہے، میں زیادہ دیر تک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی —— میرا سانس پھولنے لگا —— میرے ہونٹ جلنے لگے، نظریں جھک گئیں —— پیشانی پسینے سے تر ہو گئی —— میں خود

نہیں سمجھ سکتی —— اُن کو قریب دیکھ کر مجھے کیا ہونے لگتا ہے، یہ کیسا جذبہ ہے، جو مجھ پہ یُوں حاوی ہونے لگتا ہے، اور میں اپنے آپ کو سمندر کی طوفانی لہروں میں ڈولتی ہُوئی ناؤ کی طرح محسوس کرنے لگتی ہُوں —!

"ارے —— یہ تو شرماتی ہیں —— ہاں تو راحیلہ صاحبہ کیا آپ نے ٹیلی ویژن کا وہ کھیل دیکھا تھا —— جس میں اِنھوں نے کام کیا تھا"

وہ شاید میری پریشانی کو بھانپ گئے تھے —— جبھی تو موضوع بدل ڈالا تھا۔

"جی ہاں ——"

"سچ کہیے گا —— کس کی اداکاری زیادہ جاندار تھی؟" —— وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

"جی —— اب کیا کہوں —— کسی ایک کی بھی تعریف نہ کرنا اُس کے ساتھ زیادتی ہو گی —— سچ پُوچھیے تو آپ دونوں ہی کی ایکٹنگ قابلِ تحسین تھی" ——

"اوہ —— آپ شاید میرا دل توڑنا نہیں چاہتیں —— اپنے بارے میں تو مَیں کیا کہہ سکتا ہوں —— البتہ مِس بینا کی ایکٹنگ لاجواب تھی۔"

"کیا آپ نے پہلے بھی کسی ڈرامے میں کام کیا تھا؟" وہ مجھ

سے مخاطب تھے۔

"جی ٹیلی ویژن پر تو نہیں ——— البتہ کالج کے ڈراموں میں اکثر حصہ لیتی رہی ہوں" ——— میں نظریں جھکائے دھیمے لہجے میں بولی۔

"آپ بہت اچھی اداکاری کرلیتی ہیں ——— اگر زندگی میں آپ کو کبھی موقع ملے ——— تو اسے بطورِ کیریر اپنایئے گا ——— آپ کی آواز بھی بہت اچھی ہے ——— یقیناً آپ اپنا ایک مقام بنالیں گی۔"

اِس مشورے کے لیے میں تہہ دل سے آپ کی مشکور ہوں۔ اور اسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گی!"

اسی اثناء میں بیرا آئس کریم لے آیا ——— چند لمحے خاموشی سے گزرے۔

ہم آئس کریم سے فارغ ہوئے ——— احمر نے بیل بجائی ——— بیرا بل لے کر آیا ——— اُنھوں نے بل دیا، اور بیرے کو ٹپ بھی دی!

ہم باہر نکل آئے ———

خدا جانے ——— پھر کبھی ان سے ملاقات ہو گی بھی یا نہیں، میں یہ سوچ کر اُداس ہو گئی ———

"اچھا ——— احمر صاحب، ہمیں اجازت دیجیے ———

——بہت دیر ہو گئی —— آپ کی اِس دعوت کا ——
بہُت بہُت شکریہ !!"

راحیلہ کی آواز نے سکوت کو توڑا۔

" آپ شرمندہ کر رہی ہیں مجھے —— پھر کبھی بھی آپ مجھے خدمت کا موقع —— دیجیے گا —— آپ کی معیّت میں وقت گزار کر مجھے دلی مسرّت ہوگی ——"

تو —— پھر —— کب مُلاقات ہوگی —" ؟ اُنھوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

" یہ تو مِس بینا سے پُوچھیے ؟"

وہ شوخی سے بولی۔

"یہی بتائیں گی۔"

" آپ کی دوست —— بہت کم گو معلوم ہوتی ہیں —— —یا پھر —— کہیں آپ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو گئیں ——"

" نہیں نہیں" ——

مَیں بے ساختگی سے بول اُٹھی :

"یہ آپ نے —— کیسے سوچ لیا ؟ —— ہم نے بہت اچھا وقت گزارا ہے۔"

" تو پھر کب ملاقات ہوگی ؟" —— اُنھوں نے سوال دُہرایا۔

"دیکھیے —— انشاء اللہ —— جلد ہی" — میں نے جھجک کر کہا۔

اُن کے چہرے پر اطمینان کا سایہ پھیلا — انھوں نے سامنے سے گزرتے ہوئے رکشہ کو روکا۔

ہم بیٹھ گئے ——

میں نے —— الوداعی نظریں ڈالیں —— وُہ بھی میری طرف دیکھ رہے تھے۔

رکشہ روانہ ہوگیا —— اور وُہ خوبصورت نگاہیں میری نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

۲- مئی ۱۹۵۵ء

راستے بھر راحیلہ مجھے پریشان کرتی رہی ——

کہنے لگی :

"بیگم صاحبہ —— یہ کیا انداز تھے ؟ —— معلوم ہوتا تھا —— جیسے منھ میں زبان ہی نہیں —— تمھاری وجہ سے تو مَیں نے احمر کے ساتھ جانا گوارا کر لیا —— کیسے ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں —— جیسے اگر اُن کی دعوت قبول نہ کی گئی —— تو جنابہ کا دل ہی تو ٹوٹ جائے گا —— رحم آ گیا مجھے —— ورنہ —— اس وقت —— مجھے کوس رہی ہو گی —— تو بنو —— یہ بات تھی —— جبھی کھوئی کھوئی رہتی تھیں —— اسی لیے ہماری محفلوں میں دل نہیں لگتا تھا —— ہماری باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں —— دل میں تو یہ موصوف بستے تھے —— پھر ہمارے لیے جگہ کہاں رہتی ——"

"اللہ —— اب بند بھی کرو —— تم تو نہ جانے ——"

مَیں شرما گئی۔

" ہاں —— ہاں —— اب تو میری باتیں فضول ہی لگیں گی آپ کو —— ارے کیوں نہ ہو —— کانوں میں اُن کی آواز جو رس گھول رہی ہے —— نگاہوں میں اُن کے جلوے جو سمائے ہوئے ہیں " —— وہ بات کاٹ کر بولی۔

" دیکھو —— ابھی پہنچ کر سب کو بتاتی ہُوں —— ہم تو آپ کو سب سے زیادہ معصُوم سمجھتے تھے —— لیکن —— خُوب پَر نکالے ہیں، آپ نے تو " ——

" ہائے —— راحیلہ، خدا کے لیے کسی سے کچھ نہ کہنا۔ " مَیں سہم گئی —— یہ راحیلہ کی بچّی ہے بھی مُنہ پھٹ —— کیا پتہ —— کب کسی سے کیا کہہ دے —— یہ لوگ تو مجھے جینے نہ دیں گی —— پہلے ہی کیا کم فِقرے چُست کیا کرتی تھیں —— اب تو ایک اور بہانہ ہاتھ لگ جائے گا —— ستانے کے لیے۔ مَیں نے سوچا۔

" راحیلہ —— تم تو میری کتنی پیاری دوست ہو۔ دیکھو —— سیمیں اور شہلا کو کچھ نہ بتانا —— ورنہ کل ہی سارے کالج میں یہ بات مشہور ہو جائے گی —— پھر مَیں کس کس کے سامنے صفائی پیش کرتی رہوں گی —— تم تو میری اچھی سی بہن ہو نا " ——

" ہاں —— ہاں —— خوب کر لو خوشامد " —— وُہ آنکھیں گھما کر شرارت سے بولی۔ " مَیں اِن باتوں میں آنے والی نہیں ——

ارے اصل مزا تو جب ہی آئے گا ــــ جب سیمیں اور شہلا کو پتہ لگے گا ــــ دیکھنا کیسی درگت بناتی ہیں تمھاری" ــــ وہ اور زیادہ چھیڑنے لگی۔

"تو ٹھیک ہے ــ کہہ دینا سب سے ــ مَیں نے کب خوشامد کی تھی تمھاری ــ کہ ضرور چلو" ــــ مَیں چڑ کر بولی۔

"ارے ــ یہ اپنے دل سے پوچھو" ــــ وہ پھر بھی باز نہ آئی۔

مَیں نے رُخ پھیر لیا اور باہر کی جانب دیکھنے لگی ــــ جب ہم رکشہ سے اُترے، تو اس نے رکشہ والے کو پیسے دیئے ــــ گیٹ میں داخل ہوتے ہُوئے وہ سرگوشی میں بولی۔

"اب جانے دو غصّہ ــــ وہ تو سب مذاق تھا۔"

مَیں نے گھُور کر اُس کی جانب دیکھا، تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی ــــ اور مَیں بھی اپنی مسکراہٹ نہ چھُپا سکی۔

○

۶- مئی ۱۹۵۵ء

آج صبح جب میں نفسیات کا پیریڈ اٹنڈ کر رہی تھی، تو بیگم اختر نے مجھے بُلوایا۔ میں جب آفس میں پہنچی تو وُہ کچھ پریشان سی نظر آئیں — مجھے دیکھ کر بولیں :

"آؤ — آؤ — بیٹا — کہو کیسی ہو —؟"

"جی شکر ہے خدا کا" — میں کُرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اور سناؤ — پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟"

"جی، ٹھیک ہی ہے" — اُنھیں یُوں باتوں کو طُول دیتے دیکھ کر مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ خدا جانے کیا بات ہے؟ — ورنہ بیگم اختر تو ایک دم ہی موضوع پر آجانے والی خاتون تھیں۔ میرا دل انجانے خدشے سے دھڑکنے لگا۔

"بیٹا — تمھارا دل گھر جانے کو چاہتا تو ہوگا — اس مرتبہ سردیوں کی چُھٹیوں میں بھی — تو تم گھر نہ گئی تھیں — کیوں!"

"گھر جانے کو — کس کا جی نہیں چاہتا، بیگم اختر —

لیکن —— اب تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— تعلیم میں حرج ہوگا!"

"حرج تو یقیناً ہوگا —— لیکن تم جیسی ذہین لڑکی سے مجھے توقع ہے، کہ تم جلد ہی اس کمی کو پُورا کر لوگی —— اگر تم چاہو تو —— کل اپنے گھر جا سکتی ہو!"

"لیکن کیوں" —— پریشان ہو کر مَیں نے پُوچھ لیا۔

"بیٹا —— بات دراصل یہ ہے، کہ تمھارے پاپا کا خط آیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے، کہ تمھاری ممّی کی طبیعت ناساز ہے۔ اس لیے تمھیں کچھ دنوں کے لیے بھیج دیا جائے۔"

ممّی کی طبیعت ناساز ہے —— میرا دل دھک سے رہ گیا —— نہیں نہیں —— ان کی حالت یقیناً اچھی نہ ہوگی۔ ورنہ اپنی بیماری کی اطلاع وُہ مجھے کبھی نہ دیتیں —— اُنھیں تو مجھ سے زیادہ میری تعلیم کا خیال ہے —— ممّی —— میری پیاری، دُکھی ماں —— اے خدا —— اُنھیں کچھ نہ ہو —— دنیا میں وہی تو میرا واحد سہارا تھیں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

بیگم اختر نے مجھے روتے دیکھا —— تو بولیں:

"بیٹا —— گھبرانے کی ضرورت نہیں —— حوصلے سے کام لو —— خدا سے دُعا مانگو —— تمھاری ممّی —— بخیریت ہوں، اور —— اب تم جاؤ —— اپنے جانے کی

تیاری کرو ـــــ کسی چیز کی ضرورت ہو ـــــ تو تم کہہ سکتی ہو" ـــــ

مَیں بوجھل قدموں سے واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی ـــــ میرے ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ دِل ایک انجانے خوف سے ڈوبا جاتا تھا ـــــ بیگم اختر نے یقیناً مجھ سے کچھ چھپایا تھا۔ وہ باتوں کو طول دے کر میرے صدمے کی شدّت کو کم کرنا چاہتی تھیں ـــــ پاپا ـــــ ایسے انسان نہ تھے ـــــ کہ عام حالات میں ممّی کی بیماری کو محسوس کرتے ـــــ نہ ہی وہ اتنے فرض شناس تھے، کہ اس کی اِطلاع مجھے دیتے ـــــ یہ سب باتیں خلافِ توقع تھیں ـــــ اور مجھے یقین دلا رہی تھیں، کہ ـــــ کچھ ہونے والا ہے۔

○

یہ سوچ کر میری پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا ـــــ آنسو میری پلکوں کے بندھ کو توڑتے ہوئے ـــــ میرے آنچل کو بھگوتے رہے ـــــ میری آنکھیں متورم ہو گئیں ـــــ کل تک کا وقفہ یُوں لگ رہا تھا۔ جیسے ایک طویل صدی ـــــ جی چاہتا تھا ـــــ کہ کاش، پَر لگ جائیں ـــــ اور مَیں جا کر اپنی ماں کو

دیکھ لوں ——— اُن کی ہر ہر بات مجھے یاد آ رہی تھی ———
ان کی شفقت ، ان کی محبت ، میرے لیے زندگی کی سب سے انمول شے تھی ۔ وُہ میری ماں تھیں ——— مَیں نے اُن کی کوکھ سے جنم لیا تھا ، مَیں نے اُن کی گود میں اپنا بچپن گزارا تھا ——— ان کا شیریں دودھ آج بھی میری رگوں میں گرم لہُو بن کر دوڑ رہا تھا ——— ان کے ہاتھوں کا لمس مَیں آج بھی محسوس کر سکتی تھی ——— ان کے لہجے کی حلاوت مجھے اب بھی یاد ہے ——— میرے لیے وُہ روشنی کا مینار تھیں ، زندگی کے پُرخار اور انجانے راستوں میں وہ ایک شفیق راہبر کی طرح مجھے ہر ہر گام پر منزل کا پتہ دیتی تھیں ، ——— اور اب ——— خدا جانے وُہ کس حال میں ہوں ۔ کوئی اُن کی تیمارداری کرتا بھی ہوگا یا نہیں ——— پاپا تو ایسے فرض شناس کبھی نہ تھے ۔

میری تڑپ میں اور اضافہ ہوتا گیا !

کتنے گھنٹے گزر گئے مَیں کچھ بھی نہ کر سکی ——— بس گُھٹنوں میں مُنہ چھپائے بیٹھی رہی ۔

آخری پیریڈ ختم ہونے کی بیل بجی ——— لڑکیوں کے برآمدے میں سے گزرنے کی آہٹ سنائی دی ——— پھر کمرے کا دروازہ کُھلا ——— راحیلہ داخل ہُوئی ———

پُوچھنے لگی :

” بیٹا ! ——— خیریت تو ہے ۔ تمھیں بیگم اختر نے کیوں بُلایا تھا ، اور

تم واپس کلاس میں کیوں نہیں آئیں۔"

مَیں نے جُھکا ہُوا سر اٹھایا!

میری سُوجی سُوجی آنکھیں دیکھ کر وہ تیزی سے میرے قریب آ گئی۔ ہاتھوں کو تھامتے ہُوئے بے چینی سے پُوچھنے لگی:

"کیا ہُوا؟ —— کیوں رو رہی ہو؟"

"میری ممّی بیمار ہیں —— مَیں کل جا رہی ہُوں —— خُدا جانے مَیں اُنھیں کس حال میں دیکھوں گی" —— آنسُو تیزی سے میرے گالوں کو بھگونے لگے۔

وُہ کچھ لمحے چُپ رہی۔ پھر آہستگی سے بولی:

"اچھے کلمات منہ سے نکالو —— یُوں نہ سوچو —— ممکن ہے، وہ زیادہ بیمار نہ ہوں، —— تم سے ملنے کو جی چاہتا ہو، اس لیے بُلا بھیجا ہو" ——

"خدا کرے، ایسا ہی ہو —— مگر —— مَیں کیا کروں —— میرے دل کو چَین نہیں آ رہا" ——

"حوصلے سے کام لو، اُٹھو مُنہ ہاتھ دھو لو —— پھر کھانا کھانے چلیں گے۔"

"نہیں نہیں —— میرا جی نہیں چاہ رہا" ——

"اُٹھو —— بدشگونی نہ کرو" —— وُہ اِصرار کرتے ہُوئے بولی۔

"واقعی، راحیلہ بھوک بالکل محسوس نہیں ہو رہی۔"

"تو تم —— منہ ہاتھ تو دھو لو —— میں تمھارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

میں اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی ——

جب واپس آئی —— تو راحیلہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے چائے کے ساتھ اسپرو کھائی —— اور بستر میں لیٹ گئی۔

راحیلہ نے —— مجھے آرام کرنے کی تاکید کی —— اور چلی گئی۔

○

شام کو میرے کمرے میں خاصا ہجوم رہا۔

تقریباً ہوسٹل کی تمام لڑکیاں مجھے تسلّی دینے کے لیے آئیں —— جب وہ لوگ چلی گئیں —— تو راحیلہ، سیمیں اور شہلا میرے کمرے میں رہ گئیں —— اور سامان تیار کروانے میں مدد دینے لگیں۔ شہلا نے میرے چند کپڑے استری کیے —— سیمیں نے سامان سمیٹا —— اور راحیلہ اٹیچی میں کپڑے رکھنے لگی —— ساتھ ساتھ وہ میرا دل بہلانے کی کوشش بھی کرتی رہیں۔ گو اُن کے

ساتھ ہونے سے میرا غم کچھ ہلکا ہو گیا۔ تاہم دل کسی کام میں نہ لگ رہا تھا ——— میں نے اپنے آپ کو زبردستی کام میں مصروف رکھا۔

رات گئے تک وہ لوگ میرے کمرے میں رہیں ——— پھر سیمیں اور شہلا چلی گئیں ———

راحیلہ میرے کمرے میں سونے کی تیاری کرنے لگی۔

گیارہ بجے کے قریب ہم بستر پر لیٹے ——— تھوڑی ہی دیر میں راحیلہ سو گئی ——— لیکن ——— نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ میں نے دل ہی دل میں چند آیتیں پڑھیں، اور صدقِ دل سے ممی کی صحت یابی کی دُعا مانگی ———

صبح کی نسبت اس وقت میری حالت کچھ پُرسکون تھی ——— نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا، جب میری آنکھ لگی۔

صُبح اٹھی ——— ضروریات سے فارغ ہوئی ——— تو راحیلہ کے ساتھ ناشتے کی میز پر آئی ——— یہاں لڑکیوں نے ایک بار پھر ہمدردی کا اظہار کیا۔

ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے ——— کہ بیگم اختر آگئیں ——— پُوچھنے لگیں :

"تم تیار ہو بیٹا" ———

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

انھوں نے مجھے گیٹ پر آنے کی تاکید کی۔

میں اپنے کمرے میں واپس لوٹی ـــــ میں نے بیگ اٹھایا، راحیلہ نے اٹیچی تھام لی ـــــ سیمیں اور شہلا نے مجھ سے ہاتھ ملایا ـــــ اور میں باہر نکل آئی۔ گیٹ پر پہنچے، تو بیگم اختر موجود تھیں، راحیلہ کو ساتھ دیکھ کر بولیں :

"کیا تم اسٹیشن چلنا چاہتی ہو؟"

"جی" ـــــ وہ دبے لہجے میں بولی۔

میں اور راحیلہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئے، بیگم اختر اگلی سیٹ پر بیٹھیں ـــــ اور جیپ روانہ ہو گئی ـــــ اسٹیشن پہنچ کر ڈرائیور نے دو پلیٹ فارم لا کر دیئے ـــــ اور ہم اندر داخل ہوئے ـــــ میل تیار تھا ـــــ انٹر کے کمپارٹمنٹ میں بیگم اختر نے کل ہی سے سیٹ ریزرو کرا لی تھی۔ اس لیے جگہ کے لیے کوئی دِقّت نہ ہُوئی ـــــ ڈرائیور نے سامان لا کر سیٹ کے نیچے رکھ دیا ـــــ بیگم اختر ایک باسکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں :

"یہ فروٹ میں نے تمہارے راستے کے لیے لیا تھا ـــــ گھر جاتے ہی ممی کی خیریّت کی اطلاع مجھے دینا۔"

"جی اچھا" ـــــ

انجن کے وِسل کی آواز گونجی ـــــ میں نے گھڑی دیکھی ـــــ ٹرین کے جانے میں صرف تین منٹ باقی تھے۔ بیگم اختر اٹھ کھڑی ہوئیں میرے سر پر ہاتھ پھیرا ـــــ اور شفقت سے بولیں :

"بلنا حوصلے سے کام لینا"——

راحیلہ بھی اٹھی۔ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا— اور خط لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے نیچے اتر گئی۔ ٹرین آہستہ آہستہ کھسکنے لگی— راحیلہ اور بیگم اختر نے ہاتھ ہلایا— جواباً میں نے بھی ہاتھ ہلایا۔

کچھ لمحوں بعد ٹرین اسٹیشن کی حدود سے نکل چکی تھی، اُس کی رفتار تیز ہو چکی تھی— اور پہیئے ایک بے ہنگم سا راگ الاپ رہے تھے— سرسبز درخت— اُونچے پہاڑ اور مٹیالی زمین— بھاگتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

○

۸۔ مئی ۱۹۵۵ء

سفر بہت بور رہیت سے کٹا ——— کمپاٹمنٹ میں چند ادھیڑ عمر کی خواتین زیورات سے لدی پھندی بیٹھی تھیں ——— اُن کے تین چار شریر بچے سیٹوں کے درمیان اُچھلنے، کودنے اور شرارتیں کرنے میں ——— مصروف تھے ——— ذرا سی دیر بعد اُن میں ——— لڑائی ہونے لگتی، ——— جس پر شکست خوردہ بچہ چیخ چیخ کر رونے لگتا ——— یہ دیکھ کر اس کی ماں ڈانٹ ڈپٹ کرتی ——— اور پھر دُوسری خواتین کے ساتھ بلند آواز سے باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتی ——— اُن کی گفتگو کا موضوع آج کل کی مہنگائی تھا۔

کوئی اشیائے خوردنی کی مہنگائی کا رونا رو رہی تھی ——— اور کوئی سونے کے بڑھتے ہوئے بھاؤ پر پریشان تھی ——— پھر ——— آج کل کی نسل ——— اُس کے رُجحان ——— ان کے نت نئے بدلتے ہوئے فیشن پر تنقید ہونے لگتی ——— ظاہر ہے، مجھے ان باتوں سے کوئی دل چسپی نہ تھی ——— مَیں کھڑکی سے چہرہ ٹکائے، ——— باہر کی چیزوں کو دیکھ رہی تھی، سرسبز درختوں کی جگہ اب ریتیلے میدان نے

لے لی تھی۔ دُور دُور کہیں کہیں، سُرمئی اور خاکی اُونچے اُونچے پہاڑ تھے۔ جن پر چند سُوکھی جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا ——— میری نظریں بے مقصد ——— ان چیزوں کا جائزہ لے رہی تھیں، لیکن ذہن میں ایک ہی خیال تھا ———

خدا جانے ممی کس حال میں ہوں گی ———

جُوں جُوں منزل قریب آتی جا رہی تھی ——— میرا دل ایک انجانے خوف سے سہما جاتا تھا ——— اور میں دل ہی دل میں مبہم سی دعائیں مانگ رہی تھی۔

ٹرین رُکی ——— میں نے متلاشی نگاہوں سے اسٹیشن کا جائزہ لیا۔ پلیٹ فارم پر بہت رش تھا۔ لیکن ان تمام چہروں میں کوئی ایک چہرہ بھی ایسا نہ تھا، جسے میں شناسا کہہ سکتی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے، کہ مجھے لینے کوئی نہیں آیا۔ میں نے اٹیچی تھامی اور بے دلی سے نیچے اُتر آئی ——— قُلی نے باسکٹ اُتاری، اٹیچی میرے ہاتھ سے لی، اور ہم باہر نکل آئے۔ میں نے رکشہ میں سامان رکھوایا ——— قُلی کو پیسے دیئے ——— اور رکشہ والا کو گھر کا پتہ بتایا ———

جانے پہچانے راستے، وُہی گہما گہمی ——— وُہی روزانہ کا معمول، وُہی خرید و فروخت، کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی، سب کچھ وُہی تھا۔

رکشہ گھر کے سامنے رُکا، میں نے میٹر دیکھ کر پیسے دیئے، اور سامان اٹھا کر اندر آ گئی۔ اٹیچی اور باسکٹ برآمدے میں پھینک کر،

مَیں جلدی سے کمرے میں گھسی۔

"ممّی ـــــ مَیں آ گئی ہُوں" ـــــ

یہ کہتے ہُوئے مَیں بستر کے قریب آئی اور گھٹنے زمین پر ٹیک کر مَیں اُن پر جھک گئی ـــــ اُف، ممی کس قدر نحیف ہو رہی تھیں، چہرہ زرد تھا۔ اور آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑے تھے۔

مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں چمک آ گئی ـــــ اُنھوں نے بازو اٹھائے اور مجھے معصُوم سے بچّے کی مانند اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

میرے خدا ـــــ

ممّی کتنی کمزور ہو گئی تھیں ـــــ

اُن کے بازو کی ہڈیاں تک نمایاں ہو گئی تھیں ـــــ

مَیں ـــــ اُن کے سینے سے چہرہ ٹکائے پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی:

ہائے ممّی ـــــ

آپ کو کیا ہو گیا ـــــ؟

آپ نے مجھے پہلے خبر کیوں نہ بھیجی ـــــ؟

ممّی ـــــ ممّی ـــــ!

آپ کو کچھ ہو گیا ـــــ

تو میرا کیا بنے گا ـــــ؟

مَیں کس کے سہارے جیُوں گی ـــــ؟

اُنھوں نے ــــ میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا ــــ اور مدھم آواز میں بولیں :

"کیوں رو رہی ہو ــــ میری بچّی ــــ مَیں ٹھیک ہُوں ــــ ایسی باتیں نہ کرو ــــ میرا دل دُکھتا ہے ــــ میرے لیے ــــ یہ تصوّر موت سے بھی ــــ زیادہ اذیّت ناک ہے ــــ تم ــــ ماں کے دل کو نہیں جانتی بیٹا ــــ تمھارے متعلق سوچتی ہُوں ــــ تو لگتا ہے ــــ جیسے جسم سے رُوح ــــ کبھی نہ نکل سکے گی ــــ میرے بعد ــــ کون تمھارا پُرسانِ حال ہوگا ؟"

"ایسا نہ کہو ــــ ممی ــــ ایسا نہ کہو ــــ ؟

خدا تمھیں ــــ ہمیشہ سلامت رکھے ــــ میری زندگی بھی تمھیں مل جائے ماں ــــ"

میری ہچکیاں بندھ گئیں ۔

ممی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ، ــــ اُنھوں نے میرا سر اٹھایا ، گالوں کو چُوما ــــ کہا ــــ

" اچھا ــــ اب چُپ ہو جاؤ ــــ تم آگئی ہو ــــ اب مَیں ــــ جلد ٹھیک ہو جاؤں گی ــــ اٹھو ، مُنھ ہاتھ دھو لو ، ــــ دیکھو ــــ کیا حالت ہو رہی ہے ــــ سارے بال خاک آلُود ہو رہے ہیں ، ــــ جاؤ " ــــ

"ممّی ـــــ پاپا کہاں ہیں ؟ ـــــ اچانک اُن کا خیال آنے پر میں نے پوچھا۔

"میری دوا لینے ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں !"

" اچھا" ـــــ مجھے یقین نہ آیا۔

اُنھوں نے نظریں پھیر لیں۔

اور میں نے بھی زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا ـــــ

○

۱۱- مئی ۱۹۵۵ء

ممی کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی —— ان دو دنوں میں —— میں نے اُن کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ چھوڑی —— وقت پر دوا دیتی، اُن کے کھانے کے لیے —— ڈاکٹر کی تجویز کردہ خوراک خود احتیاط سے پکاتی، اور پھر اصرار کر کے کھلاتی —— دل بہلانے کو اُمید افزا باتیں کرتی، یا پھر اُن کی خواہش پر کچھ پڑھ کر سنانے لگتی۔ رات کو جب تک وہ سو نہ جاتیں، میں اپنے بستر پر نہ لیٹتی۔ لیکن اُن کی حالت دیکھ دیکھ کر میرے دل پر جو کچھ گزرتی تھی، وہ میں ہی جانتی تھی۔ ممی، بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھیں —— اتنی کمزور، کہ دیکھ کر —— وحشت ہوتی تھی —— ذرا سی دیر تک —— مسلسل بات کرتیں، تو ہانپنے لگتیں —— خوراک بھی بس برائے نام ہی کھا سکتیں، ——

گو پاپا کے کہنے کے مطابق —— ان کی حالت پہلے سے بہتر تھی —— لیکن، مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے چراغ تیل ختم ہو جانے کے بعد ایک بار بھڑک اُٹھتا ہے —— اور، پھر

بُجھ جاتا ہے۔

اُن کی حالت بھی یونہی سنبھلی تھی!

لیکن ———

ایسے خیال کے آتے ہی، ——— میں خدا کے حضور ———
جھک کر عاجزی سے ——— اُن کی صحت یابی کی دُعائیں ——
مانگنے لگتی ———

پاپا بھی اب اُن کا خیال کرنے لگے تھے!

وقت پر دوا اور پھل لا دیتے ہیں۔

——— لیکن ——— !

مَیں سوچتی ہُوں ——— کہ اب اس کا کیا فائدہ ہے ———
ان کی بے رُخی، اور بے حسی میری ماں کو ——— بسترِ مرگ تک
لے آئی ہے ——— اور ——— اُن کے گزشتہ سلوک کی تلافی
کوئی نہیں کر سکتا ——— وہ خود بھی نہیں ———

کچھ باتیں اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہیں۔ اگر اُن کا رویّہ
ممّی کے ساتھ اچھا ہوتا ——— تو ممّی ——— کبھی اس حالت کو
نہ پہنچتیں۔

اس خیال کے آتے ہی ——— پاپا کی طرف سے میرا دل متنفّر
ہو جاتا ہے۔ مَیں بہت کم اُن سے بات کرتی ہُوں ——— جہاں
وُہ ہوتے ہیں ——— وہاں بیٹھنے تک سے گریز کرتی ہُوں،

شاید، ممّی میری نفرت کو ——— بھانپ گئی تھیں ——— تبھی تو رات کہہ رہی تھیں :

" بیٹا ——— وہ تمھارے باپ ہیں ——— تمھیں اُن کا خیال رکھنا چاہیئے ، ——— اُن کا احترام کرنا چاہیئے ۔"

" احترام تو کرتی ہوں ممّی " ——— مَیں اُن کے سینے میں مُنھ چھپاتے ہوئے بولی ۔

یہ عورت کتنی عظیم ہے ——— اُس شخص کا بُرا بھی نہیں چاہتی ۔ جس کے ناروا رویّہ اور دل شکن باتوں نے اُسے اُس زہر کی مانند جو انسان کو رفتہ رفتہ ختم کر ڈالتا ہے ، اس حالت تک پہنچا دیا تھا ۔ لیکن اب بھی شاید وُہ اُن سے محبّت کرتی ہیں ——— اُن کے حقوق کا خیال رکھتی ہیں ، ——— میرے جی میں آیا ——— مَیں اُن سے پُوچھوں آخر نفرت کا جواب محبت سے کیسے دیا جاتا ہے ؟ ——— نہ جانے وہ صبر ، اور ضبط کے کِن کِن دُشوار گزار مرحلوں سے گزرتی ہوں گی ۔ جبھی نفرت کے خار دار کانٹوں کے بدلے اُن کی جھولی میں ——— محبّت کے پھُول ڈالتی ہوں گی ——— اُن کا اپنا دل زخموں سے چھلنی ہو چکا ہے ۔ لیکن وہ پاپا کے دل کو ہلکی سی ٹھیس پُہنچانا نہیں چاہتیں ۔ غم سہتے سہتے وہ نڈھال ہو گئیں ——— لیکن ——— زبان سے کوئی شکوہ نہ کیا ۔

یہ عورت تو اس قابل تھی ، کہ اس کی پرستش کی جاتی ———

لیکن پاپا نے ان کی قدر نہ کی ـــــــ

پاپا ـــــ آپ بہت بد قسمت ہیں ـــــ ہیرے کی قدر نہ جانی ،
آئندہ دس جنموں میں بھی آپ ایسی عورت نہ پا سکیں گے !

ـــــ لیکن ـــــ !

مَیں کچھ نہ کہہ سکتی ، کچھ نہ پُوچھ سکتی ـــــ آخر ـــــ وہ میری
ماں ہیں ـــــ مَیں اُن کے سامنے یہ سب کچھ کیسے کہہ دُوں ـــــ
اور ـــــ پھر ـــــ اب اِن باتوں سے حاصل بھی کیا ہے ؟

۱۵- مئی ۱۹۵۵ء

کل شام سے ممی کی حالت بتدریج گرتی چلی جا رہی ہے۔ بخار نے شدت اختیار کر لی ہے۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے، کہ انھیں ہاسپٹل میں داخل کرا دیا جائے۔

آج صبح ہم انھیں ہاسپٹل لے آئے ہیں — دس بجے کے قریب انھیں گلوکوز لگا دیا گیا، جو قطرہ قطرہ اُن کے لہو میں تحلیل ہو رہا ہے — اُن کا چہرہ دُھلے لٹھے کی طرح سفید ہے — اور ہاتھ برف کی مانند سرد — اُن کی آنکھیں بند ہیں — اور لانبی، گھنی، سیاہ، پلکیں اُن پر سایہ کیے ہوئے ہیں — کمرے میں ایک بیکراں سناٹا چھایا ہُوا ہے۔ مجھے اس خاموشی سے وحشت ہو رہی ہے، — میں بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتی ہوں — اور پھر پلٹ کر اِس پلنگ تک آتی ہوں، جس پر میری ماں بے حس و حرکت لیٹی ہے — میں اُن کی پیشانی سے بال ہٹاتی ہوں —

مدھم مدھم لہجے سے انھیں پُکارتی ہوں — لیکن وہ جواب نہیں دیتیں، — آنکھیں نہیں کھولتیں۔

مَیں بھیانک اُداسیوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہُوں ——
اُداسی میرے انگ انگ سے بے رنگ خوشبو بن کر اُڑ رہی ہے،
میرے چہرے پر کرب انگیز تلخی ہے، اور ذہن ویران خیالات کی
دبیز کہر میں ڈوبا ہے —— روشنی اور اُمید کی کوئی ہلکی سی رمق
بھی باقی نہیں رہی —— مَیں پریشان افکار کے کھنڈروں میں ——
بھٹک رہی ہُوں، اور سوچ رہی ہُوں۔

غم —— انسان کے چراغِ حیات کو کتنی جلد گُل کر دیتا ہے۔
یہ اندرُونی ہیجان، اور ذہنی خلفشار کِس قدر اذیّت ناک ہے ——
یہ بے رحم ویرانی —— یہ خاموشی —— اُس قبرستان کی
مانند ہے —— جس پر ہمہ وقت مستقل سنّاٹا چھایا رہتا ہے ——
یہ تنہائی —— یہ کرب تو مجھے بھی اپنے اندر سموئے لیتا ہے۔
یوں لگ رہا ہے، جیسے مَیں کِسی متلاطم سمندر کی لہروں میں ——
گھِری ہوئی ہُوں —— اور یہ طوفانی لہریں مجھے گہرے پانی میں
دھکیلتی چلی جا رہی ہیں۔ جہاں اندیشے، اور وسوسے —— زہریلے
سانپوں کی طرح —— میرے آس پاس رینگ رہے ہیں۔ مجھے
اِن سے خوف آ رہا ہے۔ مَیں اِن خیالات سے —— چھٹکارا کِس
طرح پاؤں ——

آج کا دن —— کِس قدر طویل ہے —— گزرنے نہیں پاتا۔
یہ تکلیف دہ لمحے ختم کیوں نہیں ہو جاتے، —— مَیں کِس سے اپنا

غم بیان کروں —— میں نڈھال ہوئی جا رہی ہوں —— میرا دل ڈوب رہا ہے —— یوں لگتا ہے —— جیسے جسم سے جان نکلی جا رہی ہو ——

دروازہ کھلا —— لیڈی ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوئیں —— انھوں نے نڈل (N/D/L) ممی کی کلائی کی رگ سے نکالی۔ سوئی کی نوک پر خون کا ایک سرخ قطرہ لرز رہا تھا ——

ڈاکٹر اُن کی پلس چیک کر رہی ہے —— اور میں اُمید و بیم کے عالم میں ان کے چہرے کا جائزہ لے رہی ہوں —— اُنھوں نے ممی کا جسم سرخ کمبل سے ڈھانک دیا —— اور نظریں جھکا کر واپس جانے لگیں ——

"ڈاکٹر —— میری ماں بچ جائے گی نا ؟" میری درد میں ڈوبی آواز کمرے میں گونجی۔

ڈاکٹر نے ایک ثانیے کے لیے —— میری طرف دیکھا —— اور مدھم آواز میں بولیں :

"خدا سے ان کی صحت یابی کی دعا مانگو —— اب انھیں دواؤں کی نہیں دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

وہ چلی گئیں ——

تو میں نے وضو کیا —— اور خدا کے حضور جھک کر اُن کی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔

کتنے پہر گزر گئے ــــــــ

سُورج ڈوب گیا ــــــــ

سنہری روشنی کی جگہ اندھیرے نے لے لی!

میں جانماز تہہ کر کے اُٹھ کھڑی ہُوئی ــــ دریچے سے پردہ ہٹایا۔ دُور پچھم میں کالے کالے بادلوں کی ایک عظیم دیوار آسمان پر اُوپر اور اُوپر اُٹھتی چلی جا رہی تھی۔ ہاسپٹل کے اندر لگے ہُوئے درختوں کے پتّے آپس میں ٹکرائے ــــ یُوں جیسے بند دروازے پر کوئی ہلکے سے دستک دے ــــ مجھے یُوں لگا ــــ جیسے بادلوں کی دیوار کے پیچھے سے کوئی آیا ہے ــــ میں پلٹی ــــ بستر کے قریب آئی، اور اُن کے چہرے ــــ کو یُوں تکنے لگی ــــ جیسے پھر کبھی یہ چہرہ نہ دیکھ سکُوں گی۔

بیڈ کے دائیں طرف اسٹول پر پاپا بیٹھے ــــ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، لیکن کچھ نہ بول سکتے تھے ــــ ہمدردی کا ایک جُملہ، ــــ تسلّی کا ایک بول ــــ کچھ بھی تو وُہ نہ کہہ سکے ــــ

اجنبیّت اور بے گانگی کی ایک دکھائی نہ دینے والی دیوار ہم دونوں کے درمیان حائل تھی ــــ اور ہم یُوں بیٹھے تھے ــــ جیسے ایک دُوسرے سے شناسائی تک نہ ہو، جیسے ہمارے درمیان ــــ کوئی رشتہ ــــ کوئی تعلق نہ ہو ــــ

اچانک ممی نے آنکھیں کھولیں ــــ اُن کی نظر پاپا پر پڑی،

اُن کے زرد چہرے پر تبسّم کی ہلکی سی لہر غروب ہوتے ہُوئے سُورج کی آخری کرنوں کی طرح بکھر گئی —— پھر اُنھوں نے چہرہ موڑا —— چند ثانیے مجھے دیکھتی رہیں —— پھر اُن کے بازو —— بلند ہُوئے —— مَیں آگے بڑھی —— اور اُن سے لپٹ گئی ——

"ممّی —— ممّی" —— میری آواز میں ایک ایسا درد تھا، کہ ممّی بے چین ہو گئیں —— اُن کی آنکھیں آنسوؤں کے کہر میں ڈُوب گئیں —— اور چہرے کا اضطراب غم و محبّت کی اُن کیفیتوں کا پتہ دینے لگا —— جو اُن کے دل میں موجزن تھیں —— کرب آمیز مدھم لہجے میں وُہ بولیں :

"بیٹا —— تیرا کیا بنے گا —— کیا بنے گا بیٹا تیرا" ——

اُن کی آواز ڈوب گئی —— اور بازو کٹی ہُوئی شاخ کی مانند گر گئے ——

مَیں نے گھبرا کر سر اُٹھایا —— ممّی کی نگاہیں اب تک مجھ پر جمی ہُوئی تھیں —— لیکن وہ آنکھیں اب زندگی کی روشنی سے محروم ہو چکی تھیں —— اُن کے ہونٹوں پر زندگی کی ہر شکایت —— ہر گلہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا تھا —— کوئی آواز نہیں —— کوئی آہٹ نہیں —— موت دبے پاؤں اس کمرے میں داخل ہُوئی —— اور میرا سب کچھ لُوٹ کر چلی گئی —— اور

میں بے چین بیٹھی ——— اپنے مقدر کے اُفق پر آخری کرنوں کو
روپوش ہوتے دیکھتی رہی ———
سب کچھ کھو گیا تھا ———
سب کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا ———

ہر جذبہ ——— ہر احساس ———
سب کچھ ختم ہو چکا تھا ———

ہر جذبہ انتہا سے ٹکرا کر اپنا رنگ کھو بیٹھتا ہے، اور انسانی ذہن اُس لمحے چٹیل میدان کی طرح ہو جاتا ہے ——— یہی حال میرا تھا، میری نگاہیں اُن پر جمی تھیں ——— اور میں بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے!

کمرے میں موت کا بھیانک اور لرزا دینے والا دہشت انگیز نغمہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا ———

باہر رات تاریک تھی ———

اور یہی تاریکی ہمارے دلوں پر مسلّط تھی ——— رہ رہ کر آسمان پر بجلی کوند جاتی ——— لیکن ——— ہمارے دلوں میں روشنی کی کوئی کرن نہ تھی ——— ایک لامحدود اندھیرا تھا ——— جو ہمارے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا ——— ہر جذبہ جامد تھا ——— اور مایوسی مکمل ———

اُمید کی ہر قندیل بجھ چکی تھی ———!!

پاپا اُٹھے .... اُنھوں نے ممی کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا آنکھیں بند ہو گئیں۔ پاپا کمرے سے باہر چلے گئے ——

لیڈی ڈاکٹر —— نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی —— اُنھوں نے ممّی کی نبض دیکھی —— دل پر ہاتھ رکھا —— لیکن اب وہاں کیا رکھا تھا؟ ——

اُنھوں نے کمبل سے ممّی کا چہرہ ڈھانپ دیا!

میری نظریں اب تک وہیں جمی ہوئی تھیں —— اور ذہن میں ایک سوال گونج رہا تھا ——

کیا زندگی —— پانی کے اُس بُلبلے کی مانند ہے —— جو ذرا سی دیر میں معدوم ہو جاتا ہے۔

○

غموں نے اُن کے سازِ حیات کو آخر خاموش کر ہی دیا ——

اُن کی زندگی —— حساسیّت کی بھینٹ چڑھ ہی گئی —— ناکامیوں اور محرومیوں کے بھڑکتے شعلوں نے —— اُن کے خرمنِ حیات کو راکھ کر ہی ڈالا —— غموں کے پہاڑ اُن پر کچھ اس طرح ٹوٹے، کہ سانس لینے کا یارا بھی نہ رہا —— وُہ اِتنی خاموشی سے ہم سے اِتنی دُور چلی گئیں، —— کہ ہم اگر بلانا بھی چاہیں —— تو

نہ بلا سکیں ——

ہم ہار گئے تھے !

میری دُعائیں —— میری التجائیں —— بارگاہِ ایزدی سے ٹکرا کر ناکام لوٹ آئی تھیں —— اُن کی رُوح اتنی آہستگی سے اُن کے قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی، گویا کسی برق رفتار پرندے کو آہنی پنجرے سے آزاد کر دیا گیا ہو —— اور اب وہ —— کتنے سکون —— کتنے آرام سے خوابیدہ تھیں —— ایسی نیند جس سے وہ کبھی بیدار نہ ہو سکیں گی !!

میں ایک ٹک اُن کے چہرے کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اِس مہیب سناٹے میں —— میں گم سم ایک متحیّر سائے کی مانند —— کھڑی تھی —— یُوں جیسے ہوش و خرد کی ہر رہنمائی سے عاری ہو چکی ہُوں —— میری آنکھ سے کوئی آنسو نہ ٹپکا —— میرے ہونٹوں سے کوئی صدا بلند نہ ہُوئی —— شدّتِ غم نے مجھے ہر احساس سے بیگانہ کر دیا تھا ——

پھر ہم اُن کی نعش کو گھر لے آئے !

کچھ ہی دیر میں اُن کی موت کی خبر چہار سُو پھیل گئی —— گھر کے اندر عورتوں کا ہجُوم تھا —— اور گھر کے بیرونی حِصّے میں مردوں کا —— ممّی کے نہلانے کا انتظام پڑوسن خالہ نے کیا —— میں تو کچھ کرنے کے قابل ہی نہ تھی —— عورتیں میرے صبر،

میرے ضبط پر حیران تھیں۔

گھر میں لوبان اور کافور کی مقدّس خوشبو بکھر گئی تھی۔ ممّی کو نہلا کر سفید، اُجلا، بے داغ لباس پہنا دیا گیا تھا ـــــ عورتیں مجھے پکڑ کر اُس پلنگ تک لے آئیں ـــــ اُف ـــــ مَیں کہہ نہیں سکتی ـــــ ممّی کے چہرے پر کتنا نُور تھا ـــــ چہرہ تر و تازہ تھا ـــــ یُوں لگتا تھا ـــــ جیسے وُہ ایک گہری اور پُرسکون نیند سو رہی ہوں! اس سفید لباس میں وُہ کتنی مقدّس لگ رہی تھیں۔

قریب سے ہی کسی عورت نے کہا:

"بیٹا ـــــ اپنی ماں کو اچھی طرح دیکھ لو ـــــ کہ آج کے بعد یہ چہرہ تم کبھی نہ دیکھ سکو گی! تم ہمیشہ کے لیے ان کی شفقت، ان کی محبت سے محروم ہو چکی ہو"۔

جیسے کسی نے پگھلا ہُوا سیسہ میرے کانوں میں ٹپکا دیا ـــــ میرے گم شدہ ہوش و حواس لوٹ آئے ـــــ میرے دل میں درد اور محرُومی کا طوفان پھٹ پڑا ـــــ ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے ـــــ ماں کی محبت محرومی کا احساس جاگ اُٹھا ـــــ کتنی عظیم محرومی تھی یہ!

ممّی ـــــ مجھ سے ہمیشہ کے لیے رُوٹھ گئیں ـــــ اُن کی آواز مَیں کبھی نہ سُن سکوں گی!!

اب مَیں اُنھیں کبھی نہ دیکھ سکوں گی!

اُن کے ہاتھوں کا وُہ مہربان لمس مجھے کبھی میسّر نہ آسکے گا، میرا ذہن شعلوں کا آتش کدہ بن گیا ——

میرے چہرے پر راکھ اُڑنے لگی!

مَیں چاہتی تھی —— کہ غم کے اظہار کے لیے آنسوؤں سے بڑھ کر کسی چیز کا سہارا لوُں —— بھڑکتی آگ —— لپکتے شعلوں پر پانی کے چند قطرے بھلا کیا حیثیت رکھتے تھے! —— لیکن —— یہ آنسو —— میرے دل کے زخموں کو چھوُ کر باہر آئے تھے۔ میرے دل کا لہُو قطرہ قطرہ بن کر میری آنکھوں سے ٹپک رہا تھا —— ایسا رونا —— تو مجھے پہلے کبھی نہ آیا تھا —— ہر محرومی —— ہر یاد —— ہر حسرت، دل کی گہرائیوں سے ایک جھرنے کی طرح پھُوٹ نکلی —— اور مَیں بلک بلک کر رونے لگی۔

پھر پاپا اندر آئے ——

انھوں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا —— اور کچھ لوگوں کے ساتھ پلنگ اٹھایا —— اور باہر جانے لگے —— آیتوں اور دعاؤں کی چھاؤں میں وہ ہمیشہ کے لیے —— اس گھر سے —— رخصت ہوگئیں ——

میری چیخوں —— میری آہوں سے کمرہ گونج رہا تھا —— اور باہر تاروں کی مدھم مدھم روشنی میں —— میری ماں اپنا آخری سفر طے کر رہی تھی!!

پھر وہ لوگ واپس لوٹ آئے —— اور اپنے ساتھ قبرستان کی ویرانی سمیٹ لائے۔

رفتہ رفتہ سب اپنے گھروں کو واپس لوٹنے لگے —— روتے روتے میں بے حال ہو چکی تھی —— یوں لگتا تھا، جیسے ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑوں گی!

○

کتنی قیامت خیز رات تھی وہ ——

وُہی گھر تھا —— وُہی در و دیوار تھے —— لیکن ویرانی اتنی تھی —— کہ بیان نہیں کر سکتی —— یُوں لگتا تھا —— جیسے کسی آسیب زدہ مکان میں آ گئے ہوں —— جیسے کتنی ہی رُوحیں سسکیاں بھرتی پھر رہی ہوں —— باہر پتّہ کھڑکتا —— تو میرا دل سہم جاتا —— آج یہ گھر کتنا بیگانہ —— کتنا اجنبی —— لگ رہا تھا —— اس گھر کی رونق امّی کے دم قدم سے تھی۔ وہ نہ رہیں —— تو کچھ بھی نہ رہا ——

اپنے گھر میں میرا یہ عالم ہے —— تو ممّی کا اُس ویران سنسان قبرستان میں منوں مٹی تلے کیا حشر ہو گا۔

دہشت سے میرا رواں رواں —— کانپ رہا تھا ——

میرے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے —— اور جسم برف کی مانند سرد ہونے لگا تھا !!

باہر تیز آندھی چل رہی تھی ——

درختوں کے سوگوار پتّے —— آپس میں گلے مِل مِل کر رو رہے تھے ——

ہوائیں سِسکیاں بھر رہی تھیں ——

ایک طوفان تھا !

جو ہمارے گھر سے گزر گیا تھا ——

ایک طوفان تھا !

جو باہر ہر چیز کو اپنے ساتھ اڑائے لیے جا رہا تھا ——

آخر یہ طوفان کیوں آتے ہیں ؟ —— اپنے جلو میں تباہی اور بربادی لیے ؟ ——

مَیں ڈر رہی ہُوں ——

کانپ رہی ہُوں ——

کاش ، کوئی مجھے تسلّی دے ——

کسی کی آغوش ——

کسی کے بازوؤں میں مجھے پناہ مِل جائے ——

لیکن یہاں کون ہے ؟ ——

کوئی نہیں —— کوئی بھی نہیں ——

نہیں ——— شاید میں بھول رہی ہوں ——— بازو والے کمرے میں پاپا ہیں ——— لیکن ——— میں اُن کے پاس نہیں جا سکتی ——— ممّی کی موت نے ہمارے درمیان ایک ایسی خلیج حائل کر دی ہے، جسے میں عبور نہیں کر سکتی ——— مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ پاپا ——— ممی کے قاتل ہیں ———

قتل صرف وُہی تو نہیں ——— جو کسی مُہلک دوا ——— یا اوزار سے کیا جائے ———

بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں ——— جو انسان کے اندر کے ہر جذبے ——— ہر احساس ——— ہر حوصلے کو مار ڈالتی ہیں ——— پھر انسان جیے تو کیسے ؟

پاپا کا رویّہ ——— اُن کا سلُوک ——— ممی کے لیے ایک مہلک زہر تھا ——— ایسا زہر جس کا کوئی تریاق نہ تھا ——— اسی لیے تو میں کہتی ہوں ———

پاپا ——— ممّی کے قاتل ہیں ———

میں اُنھیں کبھی معاف نہیں کروں گی ———

میری ماں کی ہر خواہش ——— ہر تمنّا ——— ہر مسرّت کا ——— گلا گھونٹ دیا تھا انھوں نے ——— وہ یہاں سے ناکام و نامُراد واپس چلی گئی ———

میری مظلوم ماں ——— جس کا گلشنِ حیات دورِ بہاریں بھی

خزاں رسیدہ رہا ــــ جب باغبان ہی محبت میں پنپنے والی بیل پر انگارے برسانے لگے ــــ تب بھلا ــــ جھلسی ہوئی بیل پر پھول کھل سکتے تھے کیا؟ ــــ

انسان کا دل تو ایک ایسی عمارت کی طرح ہے، جو کبھی تو بجلی گرنے پر بھی کھڑی رہتی ہے، اور کبھی ایک بال جیسی دراڑ پڑنے سے گر پڑتی ہے ــــ

ازدواجی زندگی کے محل میں بھی کوئی ایسی دراڑ پیدا ہو جائے ــــ تو بنیادوں تک کو ہلا دیتی ہے ــــ کیا ــــ پاپا ــــ یہ نہیں جانتے تھے!!

○

۲۰- مئی ۱۹۵۵ء

آج ممی کو اِس دنیا سے رُخصت ہُوئے تیسرا دن ہے —— آج اس گھر میں قرآن پاک کا ختم ہے —— اگربتیوں کی خوشبو چہار سُو بکھری ہوئی ہے —— اور لوگ عقیدت سے سر جھکائے تلاوت میں مصروف ہیں ——

مجھے آج ہی ٹرین سے واپس جانا ہے —— میرا جی نہیں لگتا —— کوئی ویرانی سی ویرانی ہے یہاں —— اور پھر اب یہاں کون ہے؛ جس کے لیے مَیں رہُوں —— اس گھر سے میرا تعلق —— میرا رشتہ ختم ہو چکا —— یہ گھر —— یہ در و دیوار —— سب کچھ میرے لیے بیگانے بن چکے ہیں —— اب مَیں یہاں ایک لمحہ نہیں رہنا چاہتی —— یہاں کی ایک ایک چیز سے مجھے ممی کی خوشبو آتی ہے سامنے ہی وہ تخت پڑا ہے۔ جس پر ممی کو آخری غسل دیا گیا تھا —— سرِ شام جب میری نظر اُس پہ پڑتی ہے، تو یُوں محسوس ہوتا ہے —— جیسے ممی اب تک وہاں محوِ آرام ہے —— رات کو جب کبھی ذرا سی آنکھ لگتی ہے —— تو ممی میرے اُوپر جھکی ہوتی ہیں —— اور جب

آنکھ کھلتی ہے، تو کچھ بھی نہیں ہوتا —— اِن برآمدوں میں ——
اِن کمروں میں —— ممّی کے قدموں کے نشان اب تک —— سوئے
ہوئے ہیں، —— آرائشی چیزیں ویسی ہی سجی ہوئی ہیں ——
جیسے انھوں نے رکھی تھیں —— اِن چیزوں پر ان کی انگلیوں کا
لمس اب تک موجود ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے میں اچانک ——
چونک جاتی ہُوں —— مجھے یوں سُنائی دیتا ہے —— جیسے وُہ
مجھے پکار رہی ہوں —— میں چاروں اُور دیکھتی ہوُں —— لیکن
کچھ نظر نہیں آتا —— مجھے لگتا ہے —— جیسے کچھ عرصہ میں اور
یہاں رہی تو اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں گی —— اس لیے آج شام
میں یہ جگہ چھوڑ رہی ہُوں ——

گو کہ پاپا نے اصرار کیا —— کہ ابھی کچھ عرصہ یہاں رہُوں ——
لیکن —— میں نے سرد مہری سے انکار کر دیا —— تو وہ بھی خاموش
ہو گئے —— وہ مجھ سے نظریں ملا کر بات نہیں کرتے —— شاید
اپنی کوتاہیوں کا اُنھیں احساس ہو گیا ہے —— یا پھر —— وہ میرے
خیالات سے آگاہ ہو چکے ہیں ——

ہال کمرے میں ممی کی مغفرت کی دعا مانگی جا رہی ہے —— میں بھی
وہاں گئی —— اور صدق دل سے آنکھیں بند کر کے اُن کے لیے
دعا مانگنے لگی ——

پھر فقیروں، اور غرباء کو کھانا کھلانے میں مصروف ہو گئی ——

ان کے کپڑے ان لوگوں میں تقسیم کر دیئے گئے ——

جب سب لوگ چلے گئے ——

تو میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا —— اور پھر ممّی کی آخری آرام گاہ پر اُن سے ملنے کے لیے چل پڑی۔

کیسی جگہ ہے یہ قبرستان بھی!

ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا —— کتنی ہی ہستیاں اس جگہ —— محوِ آرام تھیں —— کوئی آواز نہ تھی ——

ہوا بھی چلتی ——

تو آہستگی سے —— گویا —— اُن کے آرام میں خلل نہ ڈالنا چاہتی ہو ——

میں ممی کی قبر کے سرہانے بیٹھ گئی —— اور دھیمی آواز سے تلاوت کرنے لگی —— پھر دُعا مانگی —— میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے —— میں نے کتبے پر اُنگلی پھیری —— یہاں ممّی کا نام اور وفات کی تاریخ درج تھی —— اُن کی قبر پہ بچھے ہوئے پھول ابھی نہ مُرجھائے تھے —— قبر پہ چھڑکا ہُوا پانی ابھی خشک نہ ہوا تھا ——

اور میرے دل کا زخم ابھی ہرا تھا ——

کتنی ہی دیر ہو گئی —— سکوت پہلے سے بھی زیادہ —— مہیب ہو گیا تھا ——

قبروں کے درمیان دوزانو بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا —— کہ میں اِن قبروں کے اندر سونے والوں سے پوچھوں —— مجھے بھی موت کے متعلق کچھ بتاؤ۔ کیا اپنی ذات —— اپنے وجود کو ختم کرکے سکون کی دولت مل جاتی ہے؟ —— کیا اپنے وجود کے خول سے نکل کر تم سب خوش ہو؟

لیکن ——

یہ کیسی ناممکن سی بات تھی۔ کون جواب دیتا بھلا اِن سوالوں کا۔

قبرستان کے ساتھ والی سڑک پر اِکّا دُکّا آمدورفت بھی ختم ہو چکی تھی، اور اب —— ایک چُپ —— ایک سنّاٹا —— سارے قبرستان پر محیط تھا ——

شام گھری ہوتی جا رہی تھی!

پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی جانب محوِ پرواز تھے ——

مَیں اُٹھی ——

اور سر جھکائے سڑک کی جانب ہو لی —— دفعتاً مجھے یُوں محسوس ہُوا —— جیسے میرے پیچھے پیچھے کوئی چل رہا ہے —— قدموں کی دھیمی دھیمی چاپ —— بالکل، ممی کے قدموں کی مانند، —— مَیں نے مڑ کر دیکھا —— کوئی نہ تھا —— مَیں نے اِسے اپنا واہمہ سمجھا ——

لیکن ——

کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے شانے پر کسی کے سانس کی گرمی محسوس ہوئی ——— جیسے کوئی میرے کندھے سے لگا ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ مَیں نے مضطرب ہو کر دائیں، بائیں دیکھا ——— ایک خلا کے سوا کچھ بھی نہ تھا ———

ہاں ——— البتہ ہوا تھی ———

شام کی بوجھل ہوا ———

کافور اور لوبان کی مِلی جُلی خوشبو اس میں تیر رہی تھی ——— پھر بھی، ایک نامعلوم سا احساس میرے ذہن میں جاگ رہا تھا۔

ممی میری حفاظت کر رہی ہیں!

اور اِس ویران، سنسان سڑک پہ مَیں اکیلی نہیں ہُوں ——— بلکہ وہ بھی میرے ساتھ ہیں ———

کتنے خاموش لمحے گزر گئے ———

گھر آگیا ———

مَیں اندر داخل ہُوئی ——— تو پاپا پر نظر پڑی۔ وہ شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے ———

اُنھوں نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا ——— اور پھر شاید میرے گالوں پر ——— آنسوؤں کے خشک نشان دیکھ کر وُہ سمجھ گئے، کہ مَیں کہاں سے واپس آ رہی ہُوں!!

اُنھوں نے سر جُھکا لیا ———

مَیں کمرے میں گئی —— اٹیچی تھامی اور باہر نکل آئی۔
پاپا بھی میرے ساتھ آ گئے!
اُنھوں نے ٹیکسی رُکوائی —— ہم لوگ اسٹیشن پہنچے!
ٹکٹ لیا ——
اور پھر مَیں اپنے کمپارٹمنٹ میں آ بیٹھی ——

○

جیسے ہمارے درمیان —— ایک خاموش سمجھوتہ ہو چکا تھا —— نہ وہ کچھ کہتے —— اور نہ مَیں —— لیکن پھر بھی ہم ہر بات سمجھ لیتے تھے۔

ٹرین نے وِسل دی ——
پاپا کے ہونٹ ہلے:
"پہنچ کر مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دینا۔"
مجھے یہ جُملہ بالکل رسمی سا لگا ——
اب اس کی بھی کیا ضرورت ہے —— جب کوئی تعلق —— کوئی رشتہ —— کوئی لگاوٗ —— باقی نہ رہے، تو اِن رسمی باتوں سے کیا ہوتا ہے؟
ٹرین آہستہ آہستہ کھسکنے لگی ——

میں نے جیسے خاموش نظروں سے پاپا سے پوچھا :

آخر یہ — خون کا رشتہ یا یہ تعلق ہے کیا چیز — ؟

میں سمجھتی ہوں :

یہ سب بکواس ہے —

ہمارے درمیان — اگر کوئی چیز ہے — تو ذہنی سمجھوتہ

— ورنہ کچھ بھی نہیں !

اگر خون کا رشتہ اتنا ہی پائیدار اور اہم ہے — تو میرے دل میں پاپا کے لیے کوئی جذبہ کیوں نہیں جاگتا — اس وقت میرا دل ایک چٹیل میدان کی طرح سپاٹ اور بے رنگ ہے — کوئی محبت — کوئی لگاؤ — کوئی سایہ — کچھ بھی تو نہیں، ہمارے درمیان تو بس — ایک ذہنی سمجھوتہ تھا — جو آج کچے دھاگے کی مانند ٹوٹ گیا تھا — اور اِس وقت ہم اُن مختلف منزلوں کی طرف جانے والے مسافروں کی طرح تھے جو چند گھنٹوں کے لیے ایک ہی ٹرین میں جمع ہو جاتے ہیں، اور اپنی منزل آنے پر — ٹوٹی ہوئی مالا کے موتیوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں ۔ پھر اُن میں کوئی ربط ، کوئی تعلق نہیں رہتا — میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہُوا تھا —

گاڑی کی رفتار اب تیز ہو چکی تھی — اور پاپا کا چہرہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا —

اب میرے سامنے ــــــ بھاگتے ہوئے درخت، اور ننھے مکانات تھے۔

پھر یہ بھی غائب ہو گئے!

گاڑی اب ایسی جگہ سے گزر رہی تھی ــــ جہاں سے قبرستان صاف دکھائی دے رہا تھا ــــ پھر اُنھیں قبروں کے درمیان ــــ ممّی کا ہیولا اُبھرا ــــ وہ سفید لباس میں ملبوس تھیں ــــ اُن کا آنچل ہوا میں لہرا رہا تھا ــــ انھوں نے مجھے دیکھا ــــ اور ہاتھ ہلایا، میں نے کھڑکی سے چہرہ باہر نکالا ــــ اور دبے لہجے میں الوداع کہا ــــ اور اُس وقت تک باہر دیکھتی رہی۔ جب تک گاڑی قبرستان کی حدود سے نکل نہ گئی ــــ

آج اِس جگہ ــــ اِس شہر سے میں ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو رہی ہوں ــــ میں یہاں اپنا سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہوں ــــ شاید پھر کبھی نہ آنے کے لیے ــــ

ٹرین مجھے اِس سرزمین سے دُور ــــ اور دُور لیے جا رہی تھی ــــ جہاں میری ماں ــــ ابدی نیند سو رہی تھیں۔

یہ خاک مجھے کتنی عزیز ہے!

ایسی ٹھنڈک ــــ ایسی مانوسیّت ــــ جیسی اِس مٹی میں ہے، کسی اور مٹی میں نہیں ــــ کسی بھی زمین میں نہیں ــــ اتنی بڑی دُنیا ہے ــــ جہاں گھوم کے دیکھ لو ــــ رنگ برنگے

لوگوں سے بھری پڑی ہے یہ دُنیا — مگر جو میری اپنی تھیں —
جو یہاں کی تھیں — یہاں سو رہی تھیں !!

کیا کسی اور جگہ — کسی اور زمین کو یہ شرف حاصل ہے۔
یہ جگہ میرے لیے کتنی مقدّس ہے — کہ یہاں میری ماں —
محوِ آرام ہے — اس زمین سے میرا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا،
کبھی نہیں — کبھی بھی نہیں —

○

۲۳- مئی ۱۹۵۵ء

گاڑی اسٹیشن پر پہنچی ــــــ تو بیگم اختر پہلے سے وہاں موجود تھیں ــــــ

میں اُتری ــــــ

تو اُنھوں نے مجھے گلے لگا لیا ــــــ اور شفقت بھرے لہجے میں صبر کرنے کی تلقین کرنے لگیں۔

میں نے سر جھکا کر سوچا ــــــ کہ اب ــــــ صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے ؟ ــــــ

جب ہم کالج کے گیٹ کے اندر داخل ہوئے ، تو راحیلہ ، شہلا اور سیمیں وہیں مل گئیں ــــــ

راحیلہ میرے گلے سے لگ کر رونے لگی ــــــ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔

پھر سیمیں بولی :

" راحیلہ تمھیں تو بینا کو تسلّی دینی چاہیئے تھی ــــــ تم تو خود ہی رونے بیٹھ گئیں ــــــ چلو اُسے کمرے میں لے چلو ــــــ

دیکھو ـــــ سفر کی تھکان اور غم سے کتنی نڈھال ہو رہی ہے۔"

راحیلہ نے آنسو پونچھے، ـــــ اور میرے ساتھ کمرے میں آ گئی ـــــ کتنی ہی دیر تک سیمیں اور شہلا مجھے تسلّی دیتی رہیں، اور موضوع بدل بدل کر ـــــ گفتگو کرتی رہیں ـــــ تاکہ میں زیادہ نہ سوچ سکوں۔

میں خود بھی یہی چاہتی تھی ـــــ اس لیے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔

اُس دن ـــــ ہوسٹل کی تقریباً تمام لڑکیاں وقتاً فوقتاً میرے پاس اظہارِ افسوس کرنے آئیں ـــــ

پھر شام کو سب اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں!

رات کو کھانے کے بعد ـــــ راحیلہ میرے کمرے میں آ گئی۔ اور پوچھنے لگی:

"تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

تب اچانک مجھے اس کا خیال آیا ـــــ ہاں ـــــ اب تو مجھے خود ہی اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے ـــــ پاپا سے تو جیسے میں اپنے تمام رشتے ختم کر آئی تھی ـــــ اور ممّی اب اس دُنیا میں نہ تھیں ـــــ تو اب کون میرے مستقبل کے بارے میں سوچتا ـــــ

تو بٹیا ـــــ اب خود ہی تمھیں یہ سب کچھ سوچنا ہے ـــــ

میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

اگر تعلیم جاری رکھنا چاہتی —— تو اس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور گھر سے چلتے وقت میرے پاس کرائے کے علاوہ صرف پچاس روپے تھے زیورات کی ممی قائل نہ تھیں، اور اسی لیے میرے پاس ایک سنہری زنجیر کے علاوہ زیور نام کی کوئی دُوسری شے نہ تھی —— یہ زنجیر، پچھلے سال فرسٹ آنے پر ممی نے تحفہ کے طور پر مجھے دی تھی —— اور مجھے بھی بے حد پسند تھی —— اسی لیے اسے میں کسی وقت بھی —— اپنے گلے سے نہ اُتارتی تھی —— اس کے علاوہ میرے پاس کپڑوں کے چند جوڑے اور ایک رسٹ واچ تھی —— اور بس!

تو یہ تھا میرا کُل اثاثہ ——

گھر سے چلتے وقت میں نے کچھ نہ ساتھ لیا تھا —— اور صرف اِن چیزوں کے بل بوتے پر تعلیم مکمل کر سکنے کے بارے میں سوچنا، حماقت نہ تھی تو اور کیا تھا؟ تو گویا اب مجھے بھی اپنی ضروریات کے لیے یا دوسرے لفظوں میں زندہ رہنے کے لیے خود کچھ نہ کچھ کرنا تھا —— کیا کرنا ہے؟ —— یہ فیصلہ مجھے ابھی کرنا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو بلینا؟“

راحیلہ کی آواز نے مجھے اس کی موجُودگی کا احساس دلایا۔

”اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی ہوں راحیلہ! —— مجھے یُوں لگتا ہے جیسے اب میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکوں گی —— مجھے کہیں نہ کہیں

ملازمت کرنی ہی پڑے گی" ———

"لیکن تمہارے پاپا ———" وہ حیرانگی سے بولی۔

"کچھ لوگ ——— زندہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے لیے ——— مرجاتے ہیں، ——— پھر ہمارا اُن سے کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں رہتا، اور راحیلہ ——— میں اب اس دُنیا میں اکیلی ہوں ———" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

اس کے بعد اس نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا ——— اور ہم اپنے بستروں پر خموشی سے لیٹے ——— اپنے اپنے خیالات میں کھوئے رہے!!

○

یکم جون ۱۹۵۵ء

کئی روز گزر گئے ——— میں کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔ پھر بھی میں نے اس سلسلے میں بیگم اختر سے بات کر لینا مناسب سمجھا ——— اُس روز شام ڈھلتے ہی میں اُن کے کمرے میں گئی۔

مجھے دیکھ کر ——— وہ شفقت سے مُسکرائیں، اور پاس بٹھا لیا۔ پھر پُوچھنے لگیں :

" کیسے آنا ہُوا ؟ "

تب میں نے دبے دبے لہجے میں ——— اُن سے سب کچھ کہہ ڈالا ——— !

وہ سر جُھکا کر کچھ سوچنے لگیں۔

پھر بولیں :

" بھی تمھیں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمھارا بی۔ اے کا آخری سال ہے، اور تمھاری ممّی نے پُورے سال کی فیس شروع ہی میں ادا کر دی تھی۔ اس لیے تمھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ——— فی الحال خوب محنت کرو ——— امتحان کے بعد میں خود تمھارے لیے

کسی مناسب جگہ کوشش کروں گی۔"

بیگم اختر کتنی مہربان ہیں!

مَیں نے دل میں اعتراف کیا، اور اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے موزوں الفاظ ڈھونڈنے لگی ——— لیکن اُنھوں نے ——— مُجھے اِس کا موقع نہ دیا۔

کہنے لگیں:

"تم جب بھی پریشان ہوؤ، تو میرے پاس چلی آیا کرو ——— بیٹیا ——— تمھاری ممّی ——— میری دوست تھیں، اور اب وہ اِس دنیا میں نہیں ——— تمھیں جب بھی میری مدد کی ضرورت محسوس ہو—تو بلا تکلّف کہہ ڈالنا" ———

کہو گی نا"؟ ——— اُنھوں نے پوچھا۔

مَیں نے متشکرانہ نگاہوں سے اُن کی جانب دیکھا ——— اور اثبات میں سر ہلایا ———

پھر مَیں اجازت لے کر باہر آ گئی ———

رات گہری ہو رہی تھی ——— آسمان پر ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، اور ہوا میں سبز پتّوں اور پھولوں کی مِلی جُلی خوشبو رچی ہُوئی تھی ——— یہ موسمِ گرما کی ایک خوشگوار رات کا ابتدائی حصّہ تھا۔ مَیں ٹہلتی ہوئی لان کی جانب چل دی ——— عمارت کے درمیان بنے ہُوئے فوارے کے قریب مجھے راحیلہ مِلی ———

پوچھنے لگی :

"کہاں سے آ رہی ہو ؟"

مَیں نے بیگم اختر سے ملنے کا حال سُنایا۔

وُہ خوش ہو کر کہنے لگی :

"چلو شکر ہے۔ یہ مسئلہ کچھ عرصے کے لیے تو ٹلا —— بیٹا —— مَیں تمھیں بتا نہیں سکتی —— کہ میرے جذبات تمھارے لیے کیا ہیں ؟ —— مجھے تمھارا ہر دُکھ اپنا دُکھ لگتا ہے —— اور تمھاری ہر خوشی —— اپنی خوشی —— کیا تم یقین کرو گی کہ گزشتہ تین روز سے مَیں تمھارے لیے مسلسل سوچ رہی تھی" ——

"مَیں جانتی ہُوں راحیلہ —— اور پھر اب تم لوگوں کے سوا میرا ہے بھی کون ؟" —— مَیں نے متاثر ہو کر کہا۔

چلتے چلتے ہم لان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہری بھری گھاس پر ہم قریب قریب بیٹھ گئے۔ سامنے ہی سفید چنبیلی کا درخت سفید سفید پھُولوں سے بھرا ہُوا تھا۔ کلیوں کے کچھ گچھے ہوا کے بوجھ سے نیچے گر گئے تھے۔ اور اِن کی بھینی بھینی خوشبو ہمیں گھیرے ہوئے تھی، کچھ دیر تک ہم خاموش بیٹھے قدرت کے اِس حُسن سے لُطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر راحیلہ کی —— آواز نے اِس سکوت کو توڑا ——

"بیٹا —— اُس دن کے بعد تم پھر کبھی احمر سے ملیں ؟"

جیسے بھری برسات کے بعد نیلگوں آسمان پر قوسِ قزح شوخی

سے لہراتی ہے —— بالکل اسی طرح میرے دل میں —— اُن کی یاد جھلملائی —— اور میرے تاریک دل کے گوشے گوشے کو منوّر کر گئی ——

گزشتہ دنوں اپنے غموں —— اور پریشانیوں میں کچھ ایسی الجھی رہی تھی، کہ اُن کی یاد بھی میرے دُکھوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تھی ——

لیکن ——

اب، اِس وقت میرے تصوّر میں اُن کا روشن اور مُسکراتا چہرہ بالکل واضح تھا —— وہ نہ جانے کہاں ہوں گے —— کبھی میرا خیال بھی آیا ہوگا اُنھیں —— جیسے مَیں نے اپنے آپ سے پُوچھا، اور میرے لبوں سے یہ الفاظ پھسل گئے:

"مِلی تو نہیں راحیلہ —— لیکن —— مَیں اُن سے پھر بھی مِلنا چاہتی ہُوں ——!"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا ——

خاموشی —— تنہائی —— خوشگوار سماں —— اِن سب چیزوں نے مِل کر جیسے مجھ پر سحر سا کر دیا تھا۔ اُن کے قُرب کی تمنّا —— شِدّت اختیار کرتی گئی۔ میرا جی چاہا۔ وہ اس وقت میرے قریب ہوتے۔ مَیں اُنھیں دیکھتی، چھُوتی، محسوس کرتی، اور جذب کر تی۔ لیکن اس وقت یہاں کچھ بھی نہ تھا —— جلتی ہُوئی خواہش کا دھیما، گُھلتا ہُوا درد میرے

سارے جسم پر حاوی ہونے لگا ــــ میرے رُخسار جلنے لگے ــــ اور رات پر شباب آ تا گیا ــــ دُور پچھم سے ہولے ہولے پُونم کا چاند اُبھرتے ہوئے ــــ اِس وقت آسمان کے وسط میں آ چکا تھا ۔ اُس کی تیز، دُودھیا روشنی نے ستاروں کو ماند کر دیا تھا، اور اُس کی نُورانی کرنوں نے کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا ــــ ہر شئے اپنے اصل رنگ میں نمایاں نظر آ رہی تھی، خاموش ــــ اور سحر زدہ ــــ

○

۱۴- جون ۱۹۵۵ء

جوں جوں دن گزرتے گئے —— ممّی کی موت کا زخم ——
رفتہ رفتہ مندمل ہوتا گیا —— یا دوسرے لفظوں میں یُوں کہہ لیجیے،
کہ میں اس غم کی عادی ہو گئی ——

گو اس حادثے نے مجھے پہلے سے زیادہ سنجیدہ —— اور
کم گو کر دیا —— تاہم اب میں نے —— پھر سے پڑھائی میں
دل چسپی لینی شروع کر دی ——

اور وقت گزرنے لگا!

جس طرح پُل کے نیچے ندی کا خاموش پانی بہتا ہے۔

—— لیکن ——

کبھی بہتا ہُوا معلوم ہوتا ہے، اور کبھی نہیں ——

احمر کی یاد —— اُن کا خیال —— جو کچھ دنوں کے لیے
میرے دل میں غموں اور پریشانیوں کے بوجھ تلے —— چھُپ
گیا تھا —— اب —— پھر سے اُس نے مجھے اپنی گرفت
میں لے لیا تھا ——

میں انھیں دیکھنا چاہتی تھی ——

اُن سے —— باتیں کرنا چاہتی تھی ——

لیکن !

اُن سے ملنے کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی —— تاہم میرے تصوّر میں اُن کا مسکراتا چہرہ —— روشن نگاہیں، اب تک اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر تھیں، اور جب کبھی میں تنہا ہوتی —— تب تو بالکل یُوں محسوس ہوتا —— جیسے وُہ میرے قریب ہیں اُن کی قربت کے تصوّر ہی سے میرا دل دھڑکنے لگتا —— اور گال ایسے سُرخ ہو جاتے، —— جیسے برفانی چوٹیوں پر طلوعِ آفتاب کی مانند پھیلتی ہوئی شفق —— میری آنکھوں میں چاند کا عکس —— لہرانے لگتا، —— اور ہونٹوں پر انگوروں کا رس !

تب میں سوچا کرتی ——

جن حسین آنکھوں نے اتنی دُور سے —— مجھ پر یہ سحر کر دیا ہے۔ اگر وہ سچ مچ میرے قریب آ جائیں، تو کیا ہوگا؟ —— اگر زندگی بھر یہ طلسم نہ ٹُوٹے —— اور وہ شفق گُھلی ہوئی حسین آنکھیں اپنے اندر پیار کا بے پایاں جذبہ لیے —— مجھے یونہی دیکھتی رہیں تب یہ پہاڑ سی زندگی یوں گزر جائے، جیسے پھُولوں کے —— تختے پر ہوا کا تیز جھونکا —— سن سے گزر جائے، اور کسی کو پتہ تک نہ چلے —— ایک عجیب سی مسّرت میری رُوح کو جلا بخشتی۔

تب مجھے ہر شے خوبصورت نظر آنے لگتی ——
بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے پُراسرار قصر معلوم ہوتے ——
جہاں سے کوئی اشارے کر کے مجھے بلاتا۔ ایسی دُھندلی فضا میں رنگ برنگے لہریے ناچنے لگتے، —— بگولوں کے سناٹوں میں —— موسیقی سنائی دیتی —— کیسی، اَن دیکھی تبدیلیاں میری زندگی میں لے کر وہ دبے پاؤں داخل ہوئے تھے ——

گہری سُرمئی شاموں کو ——

مَیں پہروں اپنے کمرے میں بستر پہ دراز —— عجیب عجیب، باتیں سوچا کرتی —— حتیٰ کہ اندھیرا گہرا ہونے لگتا —— اور میرا کمرہ ایک پُراسرار خاموشی میں ڈوب جاتا —— تب مَیں اَدھ کھلی آنکھوں سے جاگتے میں سنہرے خواب دیکھتی رہتی، —— میرے دل میں ایک میٹھی سی لہر کہیں سے آتی —— اور رُوح کے ذرّے ذرّے کو نغمے اور سُرور سے شاداب کرتی چلی جاتی —— اور ایک سکُون آمیز طمانیت سے میرا دل سرشار ہو جاتا ——

لیکن جب کوئی لڑکی میرے کمرے میں داخل ہو کر لائٹ جلاتی ——
اور کمرہ روشنی سے جگمگا اُٹھتا۔ تب میرے خواب دُھنکی ہوئی رُوئی کی مانند بکھر جاتے —— اور مسرّت کے اِس بے پایاں انبار پر اَن دیکھی اُداسی کے سائے چھا جاتے —— مجھے ایک دم گھٹن سی محسوس ہونے لگتی۔ میرے دل میں —— یہ خواہش پُوری شدّت کے ساتھ —— بیدار

ہو جاتی ــــــ

کاش !

وہ اس وقت میرے قریب ہوتے، تو میں اپنے دل میں آنے والے ان نئے نئے ــــــ مبہم جذبات کو اُن پر نچھاور کر دیتی ــــــ شیشۂ دل کی یہ مئے ناب اُن کے قدموں پر اُلٹ دیتی ــــ قطرہ قطرہ کر کے یہ سیال ٹپکنے لگتا ــــــ حتیٰ کہ ــــ دل کی صراحی ــــــ خالی ہو جاتی ــــ بالکل خالی ــــــ

○

۱۰- جولائی ۱۹۵۵ء

گزشتہ ہفتے سے فائنل کے امتحان شروع ہو گئے ہیں۔ ہماری مصروفیات بڑھ گئیں —— ذہن پر ہر وقت امتحان کا بھوت —— سوار رہتا ہے —— اور رات گئے تک ہم پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں ہر ایک گھنٹے بعد کمرے کی کوئی لڑکی اُٹھ کر اسٹوو جلاتی ہے —— اور چائے بنائی جاتی ہے —— چائے کے چند گھونٹ ہمیں نیند کی وادیوں سے دُور لے جا کر تازہ دم کر دیتے ہیں —— اور ہم پھر کتابوں میں کھو جاتے ہیں۔

منزل جتنی قریب نظر آنے لگے —— بیتابی اُتنی ہی بڑھ جاتی ہے کچھ یہی حال ہم سب کا ہے۔

آج کل سوائے پڑھائی کے کوئی شغل باقی نہیں رہا۔ ہر روز پرچہ دے کر جب باہر نکلتی ہوں، تو ایسے لگتا ہے، جیسے بوجھ میں کچھ کمی ہو گئی ہے۔ راحیلہ، سمیلہ، شہلا کا بھی یہی حال ہے۔ جیسے ہی ہال سے باہر آتے ہیں: ایک دوسرے سے اس دن کے پرچے کے متعلق پوچھا جاتا ہے۔ کیسا ہُوا، خدا کا شکر ہے کہ اب تک تو تمام پرچے تسلی بخش ہو گئے ہیں

تقریباً تقریباً دونوں کا یہی جواب ہوتا ہے۔ مجھے یہ سن کر ایک انجانی سی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگتی ہوں۔ خدا ہم سب کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گریجوایٹ ہونے کے بعد ہی ہم اپنے آپ کو تعلیم یافتہ لوگوں کے زمرے میں شامل سمجھیں گے — میں کبھی کبھی اُن سے کہتی۔

تو تمھارے خیال میں کیا اب تک ہم جاہل ہیں ؟ وہ چڑ جاتیں۔

محترمہ، تعلیم ڈگریوں کا نام نہیں، بلکہ اصل چیز مشاہدہ، تجربہ اور مطالعہ ہے — اگر یہ ہے، تو ٹھیک ہے — ورنہ صرف کورس کی کتابیں پڑھ ڈالنے سے تو سب کچھ نہیں آجاتا نا! راحیلہ کہا کرتی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن عملی زندگی میں اگر ڈگری پاس نہ ہو اور قابلیت مشاہدہ، تجربہ، سب کچھ ہو — تب بھی کہیں سروس نہیں ملتی — تم نہیں جانتیں — کاغذ کا یہ پرزہ ہمارے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے، اسی پر ہمارے مستقبل کا دارومدار ہے، اور خصوصاً مجھ جیسے لوگوں کے لیے، جن کا اس دنیا میں کوئی سفارش کرنے والا نہ ہو — اور جو خود اتنی آدم بیزار ہو کہ کسی سے ملنے کو پسند نہ کرے، جو خوشامد کرنا نہ جانتی ہو — اور جو صاف گو ہو، اُس کا کہیں بھی گزر نہیں ہوسکتا، اگر یہ ڈگری پاس نہ ہو تو —! آیا کچھ سمجھ میں !" میں اُس کا سر تھپتھپاتی۔

"کہتی تو تم بھی ٹھیک ہی ہو۔" شہلا سنجیدگی سے میری باتوں پر غور کرتی۔

"ہاں — تو بیٹا — پھر کاغذ کا یہ پرزہ حاصل کرنے کے بعد

تم کس لائن میں جانا پسند کرو گی؟" بیمیں پوچھتی۔

"پسند" —— میں تلخی سے کہتی —— "میں سرد کس ہابی کے طور پر نہیں، ضرورت کے تحت کروں گی، —— وُہی سب لوگوں کی طرح —— تن ڈھانکنے —— اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے —— اس دُنیا میں زندہ رہنے کے لیے —— جو راستہ سامنے آگیا —— اُسی پر چل پڑوں گی —— اور اس میں میری پسند کو کوئی دخل نہ ہوگا —— حالات مجھے کس منزل کی طرف لے جائیں گے —— یہ تو ابھی میں خود بھی نہیں جانتی" ——

۳۰ - جولائی ۱۹۵۵ء

امتحانات ختم ہو گئے ہیں ـــــ اور اب فراغت ہی فراغت ہے۔
بیشتر وقت ـــــ اِدھر اُدھر کی فضول گپّیں ہانکنے میں گزرتا ہے۔
لڑکیوں کی اکثریت گھر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہے ـــــ
اور ـــــ سب اس خیال سے اُداس ہیں ـــــ کہ اب بچھڑ
جانا ہوگا ـــــ

چار سال کی رفاقت ـــــ
دن رات کا ساتھ ـــــ
اُن کی خوشی کو ـــــ اپنی خوشی سمجھنا ـــــ
اُن کے دُکھوں پر خود آنسو بہانا ـــــ
مل کر شرارتیں کرنا ـــــ

اور اب ـــــ یہ سب ختم ہونے کو ہے ـــــ طالب علمی
کا زمانہ ـــــ زندگی کا وہ سنہری دور ہے ـــــ جو پھر کبھی لوٹ
کر نہیں آتا ـــــ

اب سب اپنے اپنے راستوں پر ـــــ رواں دواں

ہو جائیں گی —— ذمہ داری —— اور —— فرائض کا بوجھ اپنے اپنے کاندھوں پر لیے ہوئے —— بے فکری کا زمانہ تو گزر چکا ——

سیمیں، شہلا اور راحیلہ بھی بہت اُداس ہیں —— کل ہی کہہ رہی تھیں :

"کون جانے —— پھر کبھی یوُں مِل کر بیٹھنا نصیب بھی ہو گا کہ نہیں —— یہ تھوڑا سا وقت تو ہمارے لیے اتنا قیمتی ہے، —— کہ ہم اسے گنوانا نہیں چاہتے —— بلیدا! —— کم از کم یہ تھوڑے سے دن تو —— ایسے گزار لو —— کہ پھر ان کی یاد ہی ہمارے لیے وجۂ تسکین بن سکے۔"

مَیں بھی افسردہ ہو جاتی ہوُں!

مجھے معلوُم ہے —— رزلٹ نکلتے ہی —— شہلا کی شادی ہو جائے گی —— وُہ ہم سے کوسوں دُور چلی جائے گی —— پھر کون جانے، ملنا نصیب ہو یا نہ ہو ——

راحیلہ نے سائنس لی ہوئی تھی —— گزشتہ سال ایف، ایس، سی میں سیکنڈ ڈویژن آئی —— تو اس نے اس خیال سے —— بی - ایس - سی - میں ایڈمشن لے لیا، کہ میڈیکل لائن میں سیکنڈ ڈویژن کو کوئی اہمیّت نہیں دی جاتی، اور اب وہ ایم، بی، بی، ایس کرنے لاہور چلی جائے گی۔

اور پھر یہاں صرف مَیں رہ جاؤں گی ——

حالات کے رحم و کرم پر —— کل کے بارے میں کون جانتا ہے —— کیا ہو گا ؟

شروع شروع کے چند ماہ تو پاپا میرا خرچ بھیجتے رہے تھے لیکن گزشتہ ماہ —— نہ رقم آئی —— اور نہ اُن کا کوئی خط !

وہ پھر سے اپنی دلچسپیوں میں مگن ہو گئے ہیں، اور ممی —— ان کے لیے ایک بھولا بسرا افسانہ بن کے رہ گئی ہیں۔

اور —— مَیں !

مَیں تو اپنے تمام رشتے —— اُسی روز ختم کر آئی تھی —— جب —— اُس شہر سے واپس لوٹی تھی ——

مجھے تو اس پر بھی حیرت ہے —— کہ رواداری ہی کو سہی —— مگر کچھ ماہ تک —— پاپا نے میرا حال پوچھا تو —— مجھے تو اُن سے اِس کی اُمید بھی نہ تھی ——

خیر ——

وہ خبر لیں —— یا نہ لیں —— میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا ——

میرا اُن سے کوئی رشتہ ہے —— مَیں تو اِسے بھی تسلیم کرتے ہوئے ہچکچاتی ہوں ——

وہ شخص جس نے —— میری ماں کے ساتھ ہر طرح کا ——

ظلم روا رکھا —— اسے قبل از وقت موت کی وادیوں میں دھکیل دیا۔
میرے لیے کس طرح اچھا ثابت ہو سکتا ——

مجھے اب بھی اکثر خیال آتا ہے ——

موت ایک اٹل حقیقت ہے، —— اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا
—— لیکن —— پاپا کی بے رحسی نے ممی کے لیے موت کو
قریب سے قریب تر کر دیا تھا —— اگر پاپا اچھے ہوتے تو شاید
ممی اتنی جلد —— ہم سے جدا نہ ہوتیں —— شاید ——
شاید ——

○

یکم اگست ۱۹۵۵ء

سب لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی ہیں۔ کل کی ٹرین سے راحیلہ اور شہلا بھی چلی گئی ہیں۔

چار سال کی رفاقت ختم ہو گئی ——

جاتے وقت کتنا پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں —— لیکن بھلا رونے سے کیا ہوتا ہے —— وہ رُک تو نہیں سکتی تھیں نا —— مَیں دل پر وزنی پتھر جیسا بوجھ رکھے —— اپنی پلکوں تلے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے انھیں تسلّیاں دیتی رہی —— لیکن جب ٹرین چل پڑی —— تو آنسو بے ساختہ میری پلکوں کے بند توڑ کر بہہ نکلے۔

لو —— یہ سہارا بھی ختم ہُوا —— اب پھر مَیں ہوں اور میری تنہائی ——

شام کو بیگم اختر نے مجھے بُلوایا ——

اور کافی دیر تک باتیں کر کے میرے احساسِ تنہائی کو —— کم کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔

لیکن میرا دل بہت بوجھل تھا ——

جی چاہتا تھا :

خوب رو لوُں —— تاکہ دل ہلکا ہو جائے۔

راحیلہ سے مجھے کتنی محبّت تھی !

اس کا احساس تو اب ہو رہا ہے —— وہ میری ہم دم —— اور ہم راز تھی —— میرے دُکھوں اور خوشیوں کی ساتھی —— جب بھی مَیں اداس ہوتی تھی —— وہ مجھے کن کن طریقوں سے بہلاتی تھی —— مجھے خوش کرنے کے لیے —— کیسے کیسے انداز اختیار کرتی تھی —— اور اب شاید مجھے اُس جیسی دوست پھر کبھی نہ ملے ——

اچھا دوست ملنا کتنا مشکل ہوتا ہے —— اور پھر مجھ جیسی تنہائی پسند لڑکی کے لیے —— جو کبھی کسی سے کھُل کر بات بھی نہ کر سکے —— وہ کیا کسی کو دوست بنائے گی۔

آج مَیں بے حد اُداس ہوُں ——

دل کسی کام میں نہیں لگ رہا ——

تنہائی کا احساس شدت سے ہو رہا ہے ——

بیگم اختر کی باتوں کا جواب بھی —— یوُں ہی بے دلی سے دیتی رہی —— اگر یہ بھی نہ ہوتیں —— تو معلوم نہیں —— میرا کیا حال ہوتا ؟ ——

سُنا ہے :

"ڈوبتے کو تِنکے کا سہارا"۔

آج کچھ مَیں بھی یہی محسوس کر رہی ہُوں۔ جب مَیں اُن سے اجازت لے کر واپس آنے لگی —— تو اُنھوں نے —— مجھ سے پوچھا تھا :

"تم ٹیلی ویژن پر —— بحیثیت اناؤنسر —— کے کام کرنا پسند کرو گی ؟ —— تمھاری آواز —— اور تمھاری سکرین بیُوٹی تو لوگوں نے ڈرامے کے دوران بہت پسند کی تھی۔"

مَیں نے سوچا ——

جب کام کرنا ہی ہے —— تو پھر یہی مناسب ہے —— مَیں نے حامی بھر لی —— اور جب مَیں اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھی، تو اچانک میرے کانوں میں احمر کی آواز گونجی —— اُنھوں نے ایک بار کہا تھا :

"آپ کی آواز بہت اچھی ہے —— زندگی میں کبھی موقع ملے، تو اِسے بطور کیریئر اپنایئے گا۔"

اور پھر ——

وہ خود بھی تو وہاں ہیں —— مَیں انھیں دیکھ سکوں گی —— ان سے باتیں کر سکوں گی ——

یہ میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں —— اب تو مَیں نااُمید

ہو چکی تھی ——— میں اُن سے اب نہ مل سکوں گی —— یہ خیال میرے دل میں جڑیں پھیلاتا جا رہا تھا ——— کہ بیگم اختر نے ——— جیسے مجھے راہ دکھائی۔

یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہ آیا ———

اگر ایسا ہو جائے ——— تو پھر ——— وہ میرے کِتنے قریب ہوں گے؟ —— کِتنے قریب ہوں گے ——

یہ تصوّر بھی میرے لیے کِتنا مسرور کن ہے۔

○

۱۴-اگست ۱۹۵۵ء

اس گفتگو کے دُوسرے روز، بیگم اختر نے مجھ سے درخواست لکھواکر بھجوادی —— اور کل وہاں سے لیٹر آیا تھا، کہ آواز ٹیسٹ کروانے کے لیے آجائیں۔

اور آج میں بیگم اختر کے ساتھ ایک بار پھر ٹیلیویژن کے انتظامیہ آفس میں گئی۔ چونکہ ہم زیادہ واقفیت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے پہلے، ہم شہاب کے کمرے میں گئے۔ وہ بڑے خلوص سے پیش آئے، اور میرے وہاں کام کرنے کی خواہش کو سُن کر بہت خوش ہوئے، کہنے لگے:

"آپ کی آواز، مائیک پر ہم پہلے بھی سُن چکے ہیں۔ اور وہ بلاشبہ ایک بہترین آواز ہے۔ تاہم اصُولاً آپ کی آواز کا ایک بار پھر ٹیسٹ لیا جائے گا —— تاکہ ہم آپ کو اپائنٹمنٹ لیٹر بھجوا سکیں۔

اس کے بعد انھوں نے ایک اسکرپٹ دیا۔ جس کے چند پیراگراف پر انھوں نے نشان لگادیا۔ کہنے لگے —— اسے ایک بار آپ پڑھ لیں۔ اگر کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو، تو آپ مجھ سے پوچھ سکتی ہیں۔

مَیں نے اسے پڑھا، کوئی خاص بات نہ تھی —— صرف خبروں کے

انداز میں پڑھتا تھا۔

اس کے بعد وہ ہمیں لے کر اسٹوڈیو میں آ گئے اور میری آواز ٹیپ کر لی گئی —— تقریباً ایک بجے تک ہم فارغ ہو گئے —— شہاب سے اجازت چاہی —— اور باہر نکل آئے ——

مجھے احمر بے انتہا یاد آ رہے تھے —— میری متلاشی نگاہیں ہر جگہ کا جائزہ اس اُمید پہ لے رہی تھیں، کہ شاید وہ کہیں نظر آ جائیں —— لیکن —— وہ ناکام لوٹ آئیں —— میں اُن کی ایک جھلک تک نہ دیکھ سکی —— خدا جانے وہ کہاں تھے؟ ——

ہم گیٹ سے باہر نکلے اور رکشہ لیا —— کالج پہنچے —— تو میں بیگم اختر سے اجازت لے کر کمرے میں لوٹ آئی —— یہ کیسی مجبوری تھی؟ میں کسی سے اُن کے بارے میں پوچھ بھی تو نہ سکتی تھی —— خدا جانے وہ یہاں —— اِس شہر میں ہیں بھی یا نہیں —— میرے ذہن میں مختلف خیالات گردش کر رہے تھے —— اور میں بہت بے چین تھی —— یہ کیسی لگن تھی —— جو صرف مجھے تڑپائے جاتی تھی —— یہ کیسی آگ تھی؟ —— جس میں صرف میں جل رہی تھی —— آخر میں انھیں بھول کیوں نہیں جاتی۔ خدا جانے —— وہ مجھے پسند کرتے ہیں یا نہیں —— پھر اپنے آپ کو فریب دینے سے فائدہ —— میں کس آس پر انتظار کر رہی ہوں —— انھوں نے تو مجھے کبھی بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش نہیں کی —— انھوں نے مجھے کبھی تلاش کرنے کی کوشش

نہیں کی ــــ تو ــــ پھر میں کیوں اُن سے ملنا چاہتی ہوں ــــ
آخر میرے دل کو صبر کیوں نہیں آ جاتا ــــ لیکن ــــ شاید ــــ
میں اُن مرحلوں سے گزر چکی تھی ــــ جہاں ــــ دل عقل کے
فیصلے کو تسلیم کر لیا کرتا ہے ــــ اب تو میرا ذہن چاہے کوئی بھی
مشورہ دے ــــ جی یہی چاہتا ہے ــــ کہ اُن کو دیکھوں ــــ
اُن سے ملوں !!

○

۱۴- اگست ۱۹۵۵ء

آج مجھے —— اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا ہے!

پندرہ اگست سے میں —— بحیثیت اناؤنسر —— ٹیلی ویژن پر پروگرام پیش کرسکوں گی۔

سروس مل جانے سے میں بہت خوش ہوں ——

اب میں کسی پر بوجھ نہ بنوں گی ——

اس احساس ہی سے —— مجھے بے حد تسکین ہو رہی ہے،

اور پھر —— میں احمر کے قریب بھی تو رہ سکوں گی —— اُن سے باتیں کر سکوں گی —— انھیں دیکھ سکوں گی —— اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کوئی اور ہو سکتی ہے بھلا!

میں اِس تصوّر سے ہی بے انتہا مسرور ہُوں ——

میرے اور اُن کے درمیان صرف ایک رات حائل ہے ——

انھیں یقیناً اس کی خبر ہو گئی ہو گی —— کہ مجھے سروس مل گئی ہے۔

اور میرا دل کہہ رہا ہے ——

کل وہ ضرور وہاں ہوں گے!

اُن کی خواہش تھی نا ـــــ کہ میں اپنی آواز کو بطور ـــــ
کیریئر اپناؤں !

وہ بھی یقیناً خوش ہوں گے ـــــ میں نے اُن کی خواہش
کا احترام جو کیا ہے !!

بیگم اختر ـــــ آج بہت مطمئن نظر آ رہی تھیں ۔ دوپہر کو
کھانے کے کمرے ہی ملیں ـــــ

تو کہنے لگیں :

"بیٹا ـــــ

آج میں یوں محسوس کر رہی ہوں ـــــ جیسے کسی اہم فرض
سے سبکدوش ہو گئی ہوں ـــــ تم اب برسرِ روزگار ہو گئی ہو
ـــــ نہایت ذمہ داری اور محنت سے ـــــ اپنا فرض
پورا کرنا ـــــ اور اعتماد سے کام کرنا ـــــ مجھے تم پر بہت
بھروسہ ہے ـــــ مجھے یقین ہے ـــــ کہ تم کبھی کوئی غلط قدم
نہ اٹھاؤ گی !!"

میں متانت سے اُن کی باتیں سُنتی رہی ـــــ اب صرف وہی
تو میری دوست بھی ہیں ـــــ اور بزرگ بھی ـــــ قدم قدم
پر راستہ بتانے والی ، اور پھر ـــــ گزشتہ چار سالوں سے
میں اُن کے قریب رہ رہی ہوں ۔

اب تو یوں لگتا ہے ـــــ جیسے ہم ایک ہی گھر کے ـــــ

وہ ہوں! میں نے ان کی کوئی بات کبھی نہیں ٹالی —— اسی لیے وہ میری اتنی قدر کرتی ہیں ——

کافی دیر تک ہم باتوں میں مشغول رہے —— پھر میں اپنے کمرے میں آ گئی —— اور سونے کی کوشش کرنے لگی —— آج کا دن کتنا طویل معلوم ہو رہا ہے —— دن خاصا گرم بھی ہے —— بڑی مشکل سے نیند آئی!

سو کر اُٹھی —— تو دوپہر ڈھل چکی تھی ——

میں تولیہ لے کر غسل خانے میں گھس گئی —— نہا کر باہر نکلی —— تو موڈ بے حد شگفتہ تھا ——

چائے پینے کے بعد کچھ دیر تک مطالعہ کرتی رہی —— پھر بہت دیر تک ریڈیو سُنتی رہی —— اور یہ کتنی عجیب سی بات تھی، کہ آج مجھے طربیہ نغمے بہت اچھے لگے —— ایک انجانی مسرّت سے میں سرشار تھی —— مجھے اندر ہی اندر جیسے کوئی گدگدا رہا تھا —— میرا جی چاہ رہا تھا —— میں کچھ گاؤں —— بے خیالی میں میں ہولے ہولے فیض کی غزل گنگنانے لگی۔

آج یُوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

کتنے گھنٹے گزر گئے ــــــ

پھر میں لان میں نکل آئی ــــــ سورج نہ جانے کب کا چھپ چکا تھا ــــــ اور اب صاف شفاف آسمان پر ــــــ ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے ــــــ خوشگوار ہوا میں پھول ہولے ہولے جھوم رہے تھے ــــ ہوا میں گھانس اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو گھلی ہوئی تھی !

آج یہ سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا تھا ــــــ

○

۱۵۔ اگست ۱۹۵۵ء

صبح آنکھ کھُلی —— تو سب سے پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا —— کہ آج میں عملی زندگی میں قدم رکھ رہی ہوں —— اب مجھ پر کچھ فرائض عائد ہوں گے —— کچھ ذمہ داریاں سونپی جائیں گی —— اور مجھے یہ سب کچھ خوبی سے نباہنا ہے —— ذمہ داری کے احساس سے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔

مَیں بستر سے اٹھی —— منہ ہاتھ دھو کر چائے پینے کے لیے کمرے میں گئی، تو بیگم اختر آ چکی تھیں۔

کہنے لگیں:

"آج مَیں تمھارے ساتھ نہ جا سکوں گی —— کچھ خواتین مجھ سے ملنے کے لیے آ رہی ہیں —— تمھیں گاڑی لینے آ جائے گی تو تم چلی جانا۔"

مَیں خاموشی سے اُن کی باتیں سُنتی رہی!

اب تو اپنے آپ کو تنہا کام کرنے کا عادی بنانا پڑے گا —— بیگم اختر بھلا کب تک میرے ساتھ رہ سکتی تھیں۔

شام کے چار بجے کے قریب جیپ مجھے لینے آ گئی ——
جب میں اسٹیشن پہنچی —— تو ڈیوٹی روم میں مجھے شہاب ملے۔ کچھ دیر تک رسمی سی باتیں ہوتی رہیں۔

پھر کہنے لگے:

"چلیے —— آپ کو نیوز روم دکھا دوں —— اب ہر روز آپ کو یہاں سے نیوز لینی ہوں گی" ——

میں ان کے ہمراہ نیوز اسسٹنٹ کے کمرے میں گئی —— مسٹر شمس سے انھوں نے میرا تعارف کرایا —— اور آج کی نیوز لیں۔
کچھ دیر کے بعد ہم لوگ اسٹوڈیو میں آ گئے۔

"آپ ذرا اسے پڑھ لیں۔ میں ابھی تھوڑا سا کام کر کے —— حاضر ہوا"

انھوں نے کہا —— اور کمرے سے نکل گئے۔

وہ چلے گئے، تو میں خبریں پڑھنے کی ریہرسل کرنے لگی —— کچھ ہی دیر گزری تھی —— کہ دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی میں نے پلٹ کر دیکھا، —— ایک ہاتھ سے دروازہ تھامے —— گرے کلر کے سوٹ میں ملبوس احمر کھڑے تھے —— ہمیشہ کی طرح اسمارٹ اور وجیہہ —— کوٹ کے کالر میں گلاب کی ایک نیم وا کلی اٹکی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر بے ساختگی سے مسکرائے!

کہنے لگے :

"آپ یقین مانیے مس بینا ــــ آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے ــــ ناقابلِ بیان مسرت ہوئی ہے۔ کچھ روز پہلے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ آپ یہاں آیا کریں گی ــ اور آج میں صبح سے آپ کا انتظار کر رہا تھا ــــ آپ خیریت سے تو ہیں نا ــ بڑی مدت بعد آج آپ کو دیکھا ہے۔"

میری آنکھوں میں شفق کا رنگ گھلنے لگا ۔ یہ احمر کہہ رہے ہیں۔

میں آج صبح سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں ــــ احمر ــــ احمر ــــ میرا دل دھڑکنے لگا ــــ کاش میں بتا سکتی ــــ تم نے تو صرف آج میرا انتظار کیا ہے ، اور میں مدت سے تمھاری منتظر ہوں۔ میری آنکھیں تمھاری دید کی پیاسی تھیں ــــ میرے کان ــــ تمھاری آواز سننے کو ترس گئے تھے ــــ احمر ــــ احمر ــــ تم جو میرے اتنے قریب ہو۔ مجھ سے کتنی دور ہو۔

مگر میں یہ سب کچھ کہہ دینے کی خواہش رکھنے کے باوجود ــــ کچھ نہ کہہ سکی ــــ شرم کے پردے حائل رہے ــــ

بس صرف انھیں دیکھے گئی !

وہ آج بھی اُتنے ہی خوبصورت تھے ــــ اُن کی باتوں میں آج بھی مسحور کر دینے والی چاشنی تھی ــــ اُن کی آنکھوں کی ــــ وہ مقناطیسی کشش ــــ آج بھی مجھے اپنی طرف ــ کشاں کشاں کھینچ رہی تھی ، اور میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روکے ہوئے تھی۔

وہ دروازہ چھوڑ کر آگے آ گئے ——— ان کے کپڑوں کی —— بھینی بھینی مہک میرے قریب آ گئی ——— کتنی اچھی خوشبو تھی ، یا شاید مجھے اس لیے اچھی لگی ——— کہ وہ ان کے جسم کو چھو کر آئی تھی۔

"آپ نے بی ، اے کا امتحان تو دے دیا ہو گا ؟ ——— کیا رزلٹ نکلا ؟" انھوں نے پوچھا۔

"پاس ہو گئی ہوں" ——— میں مدھم لہجے میں بولی۔

"اب کیا خیال ہے ؟ ——— تعلیم جاری رکھیں گی ؟"

"حالات ایسے نہیں کہ تعلیم جاری رکھ سکوں !"

"کیوں" ——— وہ چونکے۔

"بس کچھ ایسے ہی حالات ہو گئے ہیں۔" ممّی کا خیال آنے پر میں اداس ہو گئی۔

وہ بھانپ گئے ، کچھ دیر خاموش رہے ، پھر معذرت کرنے لگے :

"میں نے شاید پوچھ کر اچھا نہیں کیا ——— آپ اداس ہو گئی ہیں ——— نہ جانے کیا یاد دلا دیا میں نے ——— !"

نہیں ——— نہیں ——— ایسی کوئی بات نہیں" ——— میں نے جلدی سے بات بدل ڈالی۔

"آپ کا وقت کیسے گزر رہا ہے ؟"

وقت ——— وقت تو گزر ہی جاتا ہے ، چاہے اچھا گزرے یا بُرا ——— ٹھیک تو رہے نا آپ !"

"دیکھ لیجیے، پہلے سے موٹا ہو گیا ہوں۔" وہ ہنسے۔

مَیں نے غور سے اُن کی جانب دیکھا — واقعی، وہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گئے تھے — رخسار سرخ ہو رہے تھے — میری نگاہیں بھٹکنے لگیں۔ ان کے ہونٹ کتنے خوبصورت ہیں اور قد کتنا اونچا لانبا ہے۔ ان کے سامنے مَیں تو بالکل چھوٹی سی لگنے لگتی ہوں۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

دروازہ کھلا —— شہاب اندر آئے!

اور مَیں سنبھلنے کی کوشش کرنے لگی۔

○

۱۶۔ اگست ۱۹۵۵ء

کل دیر تک احمر اور شہاب میرے ساتھ رہے۔ اُس شام جب میں فارغ ہو کر نکلی، تو وہ دیر تک میری آواز، میرے لہجے کی تعریف کرتے رہے اُن کی اِس حوصلہ افزائی سے میری گھبراہٹ کافی حد تک کم ہو گئی۔ تاہم اجنبیّت قدرے باقی تھی۔ یہ تو رفتہ رفتہ ہی ختم ہو گی نا ——

صبح ہوئی تو بیگم اختر نے کل کی تفصیلات پوچھیں —— میں نے ہر بات کا تسلّی بخش جواب دیا —— تو مطمئن ہو گئیں ——

فی الحال مجھے ہر ہفتے جانا پڑے گا۔

○

۲۳- اگست ۱۹۵۵ء

یہ سات دن بھی —— گزر ہی گئے!

احمر مجھے یاد تو بہت آئے، لیکن جیسے گم گشتہ راہ اپنی منزل کا نشان پاکر مطمئن ہو جاتا ہے —— کچھ ایسی ہی —— مطمئن میں ہو گئی ہوں۔

احمر سے مل تو سکتی ہوں ——

دیکھ تو سکتی ہوں ——

کیا —— یہ کم ہے؟

حسب معمول شام کو سات بجے ٹیلی ویژن کی گاڑی گیٹ کے باہر ہارن دینے لگی —— میں نے جلدی سے گرین ساڑھی کا پلّو شانوں پہ لپیٹا —— آئینے میں جھک کر اپنے آپ کو دیکھا —— جیسے چپکے سے کسی نے میرے کانوں میں سرگوشی کی :

بلبنا ——

آخر یہ اہتمام کیوں؟

یہ سیاہ بھنورا ایسی کالی کالی آنکھوں میں کاجل کی لکیریں ——

سیاہ گھٹائیں سنوارنے کا نیا انداز ——— اور لبوں پر گلاب کی کلیوں ایسا رنگ ———

آخر یہ اہتمام کیوں ——؟

کیا —— یہ سب احمر کے لیے نہیں ——؟

ہوں —— جیسے میں اپنے آپ سے شرما گئی —— آئینے کے سامنے شاید میں کچھ دیر اور کھڑی رہتی —— لیکن باہر ہارن برابر چیخے چلا جا رہا تھا —— میں نے بیگ لیا —— اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل آئی۔

پروگرام ختم کر کے جب میں باہر نکلی —— تو سیڑھیوں کے قریب ہی مجھے احمر نظر آئے ——

میں وہیں چلی گئی ——

"کیسی ہو بینا —؟" وہ مسکرائے۔

وہ مجھ سے کتنی بے تکلفی —— کتنی اپنائیت سے پیش آئے تھے، میرا دل جھوم اٹھا ———

"میرے ساتھ گھومنے چلو گی بینا۔" انھوں نے آہستگی سے پوچھا۔

احمر —— آپ کے ساتھ تو میں اس دنیا کے آخری کونے تک چلنے کو تیار ہوں —— میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"مگر کیسے؟" میں نے یونہی پوچھا۔

میرے ایک دوست اپنی گاڑی لائے ہیں —— اس میں

چلیں گے۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا ——

ہم باہر نکلے ——

سیاہ رنگ کی کار گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی —— جب ہم اُس کے قریب پہنچے —— تو کسی نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا، اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔

"یہ —— فراز ہیں، میرے بہترین دوست!

"اور فراز —— یہ ہیں مس بینا —— جن کا ذکر میں نے تم سے کیا تھا" —— احمر نے تعارف کی رسم ادا کی۔

"آداب" ——

"آداب" —— فراز نے پلٹ کر میری طرف دیکھا —— "احمر نے آپ کا غائبانہ تعارف تو کروا دیا تھا —— بڑا اشتیاق تھا، آپ کو دیکھنے کا" ——

میں نے ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالی —— تیکھے خدوخال، اور سرخ و سفید رنگت —— وہ شلوار قمیض میں ملبوس تھا —— غالباً کسی پٹھان فیملی سے تعلق رکھتا تھا —— لیکن لب و لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ تعلیم یافتہ ہے۔

"کہاں چلنا ہے؟" —— اب وہ احمر سے مخاطب تھا۔

"جہاں جی چاہے لے چلو —— اس وقت تو ہم تمھارے

رحم وکرم پر ہیں بھائی!"

"اچھا تو یہ بات ہے!" اُس نے اسٹیرنگ کی طرف رُخ پھیرا۔ اور گاڑی اسٹارٹ کی ——

سیاہ تار کول کی ہموار سڑک پر کار بغیر کسی آواز کے —— فراٹے بھرنے لگی۔

شام کا سرمئی اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا —— سڑک کے دو رویہ لگے ہوئے چیڑ اور شہتوت کے درخت ہوا سے جھوم رہے تھے۔ اور ہوا میں ان کی مانوس خوشبو رچی ہوئی تھی ——

گاڑی میں بالکل خاموشی تھی!

فراز اب بڑے لاتعلق انداز میں بیٹھا تھا —— اور پچھلی سیٹ پر احمر ذرا سے فاصلے پر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے —— میرا دل ان کی قربت کے احساس سے دھڑک رہا تھا —— اور میں چہرہ کھڑکی کی طرف کیے بے مقصد باہر کی چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔

اب ہم شہر کی حدود سے نکل آئے تھے، اور سامنے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔

سڑک بالکل ویران تھی! —— اِکّا دُکّا موٹر کبھی کبھار نظر آتی۔ اور رُکے بغیر آگے نکل جاتی ——

فراز نے موٹر روکی —— اور پوچھا:

"چائے پئیں گی آپ؟"

"چائے" ––– مَیں نے حیران ہو کر پُوچھا، ––– یہاں چائے کہاں؟"

"یہ دیکھیے" ––– اُنھوں نے تھرماس سامنے کی۔

"اوہ" مَیں چُپ ہو گئی ––– میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ احمر کو یقین تھا، کہ مَیں اُن کے ساتھ چلنے سے انکار نہ کر سکوں گی ––– جبھی تو تمام انتظام کر کے نکلے ہیں۔

تھرماس کے ڈھکن کو کپ کی جگہ استعمال کیا گیا ––– فراز نے چائے میری طرف بڑھائی۔

"پہلے آپ پی لیجیے، مَیں بعد میں پی لوں گی۔"

"جی نہیں ––– لیڈیز فرسٹ" –––

مَیں نے کپ تھام لیا۔

دوسرے ڈھکن میں چائے ڈال کر اُس نے احمر کو دی ––– چائے تازہ اور گرم تھی ––– اور پھر خلافِ توقع ––– کوئی چیز مل جائے تو اُس کا لُطف کچھ اور ہوتا ہے!

چائے سے فارغ ہُوئے ––– فراز نے تھرماس بند کر کے رکھی اور نیچے اُترتے ہوئے بولے:

"آپ لوگ یہاں بیٹھیں مَیں ذرا گھوم کر آتا ہوں۔"

اور وُہ پہاڑوں کی طرف چل دیئے ––– کچھ دُور تک وہ نظر آتے رہے ––– لیکن پھر پہاڑ کی اوٹ میں روپوش ہو گئے –––

سڑک بالکل ویران تھی ——

ہر طرف —— خاموشی تھی ——

گاڑی میں احمر میرے پاس تھے ——

اور ہمارے درمیان کوئی بھی نہ تھا ——

"بینا —— چُپ کیوں ہو بینا —— ؟"

وہ میرے قریب آ گئے —— اپنے مضبوط ہاتھ میں اُنھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا —— اور ہاتھ کی لکیریں غور سے دیکھنے لگے —— اُن کے لمس کے احساس سے میرے رُخسار سرخ ہونے لگے —— اور پورے جسم میں جیسے برقی رو دوڑ گئی —— اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ، میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"ہاتھ دیکھنا آتا ہے آپ کو ؟ —— بتائیے نا —— کچھ میرے بارے میں!"

"تمھارے بارے میں —— اچھا تو سُنو —— تم بہت خوش قسمت ہو —— اور —— اور —— یہ ہاتھ بہت نازک ، بہت خوبصورت —— اور —— بہت پیارا ہے"!! انھوں نے شرارت سے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

"ہٹیے ، —— شریر کہیں کے —— دیکھ تو آپ ایسے انہماک سے رہے تھے —— جیسے بہت بڑے پامسٹ ہوں ، لیکن جانتے کچھ بھی نہیں۔" میں ہنس پڑی۔

"جانتا ہوں ——— ایک بات جانتا ہوں ——— اور وہ یہ کہ بینا اس وقت تم میرے پاس ہو" ——— دھیرے دھیرے وُہ بولے اور اپنے بازوؤں میں مجھے سمیٹ لیا۔ میرا رواں رواں ستار کے تاروں کی طرح جھنجھنا اُٹھا ——— میرا جسم کانپا ——— اور پھر کانپ کر یکبارگی اُن کی باہوں میں پگھل گیا ——— میرے دل میں ایک عجیب سی کسک جاگی ——— اور میرے جسم میں کوئی نیم بیدار، شرمائی لجائی سی ایک نئی قوّت انگڑائیاں لینے لگی ——— پہلی محبت کی پگھلتی ہوئی ——— تب و تاب ——— یہ نرمی اور سکون ——— اُمر کی ہلکی ہلکی آواز ——— اور مجھے بے اختیار کیے ہوئے جذبۂ سپردگی، میرے رگ و پے میں مسرّت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ مجھے یُوں لگا جیسے منھ اندھیرے کی ٹھنڈی اور شبنم سے لدی ہوئی ہوا میں ——— گلاب کے شگوفوں نے اپنی پنکھڑیاں کھول دی ہوں!

"تم ——— تم کتنی اچھی ہو بینا" ———

اُن کی مدھم مدھم آواز، میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ محبّت کے اس پہلے میٹھے بول نے میری روح میں چیخ و پکار مچادی تھی، اور میرے بدن کا ذرّہ ذرّہ انتہائی اشتیاق کے عالم میں ہمہ تن گوش تھا۔

کل تک جو بات ناممکن تھی ——— آج ممکن ہوگئی تھی۔ ہر واقعہ دریا کی ایک لہر کی طرح آیا، اور ان واقعات کا آغاز یُوں ہوا۔ جیسے کسی پہاڑی سے کوئی چشمہ پھوٹ نکلا ہو۔ مَیں نے خود کو اتفاقی جذبات و احساسات

کے حوالے کر دیا۔ اس وقت اُن کی قربت کا احساس ایک ہمہ گیر احساس بن گیا تھا۔ وہ احساس — جس سے روح گنگناتی ہے، اور پوری کائنات کے لیے اپنا پن اور چاہ پیدا ہوتی ہے — اوہ — یہ لبالب چھلکی ہوئی مسرّت — جو، اب مجھے اپنے اندر جذب کیے لے رہی تھی — یہ مختصر سے فانی لمحے کتنے حسین — جذبات انگیز اور ونڈر فل تھے۔ جب میں نے اس محبوب جسم کی قربت حاصل کر لی تھی۔ جس کے لیے میری روح کئی سالوں سے خلاؤں میں بھٹک رہی تھی۔ میرے کانوں میں بہار کے چہکتے ہوئے نغمے گونجنے لگے — جیسے کہیں پھولوں کی چھاگلیں بج اٹھی ہوں! — ایک سکون آمیز طمانیت سے میرا دل سرشار ہو گیا — میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ میں نے اپنا سر ان کے کشادہ سینے پر رکھ دیا — اور سوچا —

انھیں بانہوں میں میرا گھر ہے — یہیں میرا مستقبل ہے — یہیں سکون ہے، راحت ہے — اور یہیں پھول کھلتے ہیں — اور مَیں اِسی لمحے کا شب و روز انتظار کرتی تھی — اور آج سب کچھ میرا ہے۔ وہ جھکے — میں نے اپنی گردن پر ان کے لبوں کا لمس محسوس کیا۔ اُن کے سانس کی آنچ میرے رُخسار کو چھو گئی — مَیں شرما گئی، اور اُن کے سینے میں مُنھ چھپانے لگی — اس وقت اُن کے جسم سے ایک لطیف خوشبو آ رہی تھی۔ اور اس خوشبو میں بھی اُن کی شخصیّت کی طرح ایک انفرادیّت تھی —

اور کچھ وقت گزر گیا — جس کا شمار منٹوں میں کرنا مشکل ہے کیونکہ وقت کی پیمائش، لمحوں اور ساعتوں سے نہیں ہو سکتی —

بلکہ احساسات سے ہوتی ہے۔

"بیٹیا — اٹھو بیٹیا — دیکھو فراز آ رہا ہے۔" انھوں نے دھیرے سے میرے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

میں ان سے الگ ہوئی، اور سنبھلنے کی کوشش کرنے لگی — میری آنکھوں میں شفق کا رنگ لہراتا دیکھ کر وہ فتح مندی سے مسکرا اٹھے — اور جھینپ کر میں شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

فراز نے گاڑی کا دروازہ کھولا، اور پوچھا:

"چلیں" ——

"ہاں" —— احمر نے کہا۔

اور فراز نے گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

○

۲۴- اگست ۱۹۵۵ء

ایک جگمگاتی ہوئی رنگین صبح طلوع ہوئی —— ایسی صبح پہلے کبھی طلوع نہ ہوئی تھی —— سورج کی کرنوں میں آج کچھ اور ہی —— روپ تھا۔ انوکھی تازگی اور نرالی شگفتگی تھی!

آج دن بھر میں نازاں نازاں پھرتی رہی —— اُن کے ہونٹوں کا لمس اب تک میری گردن پر تازہ تھا —— مجھے ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ جو انھوں نے لرزاں لرزاں خود فراموشی کے عالم میں کہی تھی۔ وہ باتیں جو ان تمام نئے احساسات کا سرچشمہ تھیں!

اُس لمحے اُن کا چہرہ کیسا روشن —— کیسا پیارا تھا —— اُن کی نگاہیں، —— اُف —— اُس کا تصوّر کرتے ہوئے میں اب بھی اس چھوٹی کلی کی مانند سمٹ جاتی ہوں —— یُوں لگتا تھا —— جیسے وہ نگاہوں سے مجھے چُوم رہے ہوں!

اُن کی باتوں میں کتنا بے پناہ حسُن —— کتنی رعنائی —— کتنا بانکپن تھا —— اُن کی شخصیّت میں ایک ناقابلِ برداشت کشش، اور دیوانہ بنا دینے والی رعنائی تھی —— میں ان کے تصوّر کو ——

جھٹک نہیں سکتی —— اُن کی مدھم مدھم ہنسی —— اُن کی باتوں کی شیرینی کو بھلا نہیں سکتی —— اور وہ تازہ لطیف تیرتی ہوئی خوشبو جو اُن کے جسم سے آتی تھی۔ میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے —— اُن کے بازوؤں کا مضبوط حصار میں اب بھی اپنے شانوں کے نیچے محسوس کر رہی ہوں —— تصور کے دریچوں سے میں اس عکس کو —— بار بار دیکھ رہی ہوں —— جو خاموشی سے —— ذہن پر دلفریب رنگ بکھیرتا چلا جاتا ہے۔

وہ میرے ہیں —— میرے ہیں —— خوشی کا پاگل کر دینے والا احساس میری رگ رگ میں کروٹیں لے رہا ہے۔ میری آنکھوں میں چاند کا عکس لہرانے لگا —— اور ہونٹوں پر انگوروں کا رس —— وہ اپنے ہمراہ کیسی نئی نئی اور عجیب مسرتیں لے کر آئے تھے۔ یہ نئی نئی تبدیلیاں جو مجھ میں رونما ہو رہی ہیں۔ انھیں بیان کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے کوئی میرے جذبات کی گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکتا، کہ میرے جذبات کیا کیا شدید صورتیں اختیار کر رہے ہیں۔ جو ناگہاں آندھی کی طرح —— بے روک ٹوک مجھ پر چھاتے چلے جاتے ہیں۔

یہ ایکا ایکی میرے دل کا کون سا دریچہ کھل گیا ہے، کہ محبت کا ایک سیلاب نُور آداخل ہوا ہے —— یہ دریچہ آج تک بند کیوں تھا؟

اب اس وقت اُن کی یاد میرے دل میں یوں تیر رہی ہے۔ جیسے جھیل کی سطح پر تیرتا ہوا کنول کا پھول —— ہوا کے جھونکوں سے رقص

کرنے لگے۔ اوہ ـــــ وہ ان کی نگاہوں کا جادو ـــــ مسکراہٹوں کی بے پناہ لطافت، اور پیاری پیاری معصوم باتیں، میری زندگی میں کتنی خوشیاں لے کر آئی ہیں ـــــ میں اس وقت اپنی بساط سے بڑھ کر ـــــ خوش ہوں ـــــ آج ہر چیز ہی نیا رنگ ـــــ نیا حسن ہے، ـــــ ہلکے پھلکے بادلوں کے ٹکڑے مجھے حسین قصر معلوم ہو رہے ہیں، جہاں سے کوئی مجھے اشارے کر رہا ہے۔ بگولوں کے سناٹوں میں مجھے موسیقی سنائی دے رہی ہے، جیسے وہ کوئی مسرور نغمہ ہو، جو انبساط کی کوکھ سے جنم لے کر آسودگی کی گود میں پروان چڑھ رہا ہو۔

اور میں سوچ رہی ہوں ـــــ یہ محبت بھی کیا عجیب شے ہے۔ کبھی جلنے کا حوصلہ بخشتی ہے، اور کبھی راستے کا کانٹا بن جاتی ہے۔ کبھی دھرتی کی کوکھ ہری کر دیتی ہے، اور کبھی اُسے ہمیشہ کے لیے بانجھ بنا دیتی ہے۔ محبت اگر خود ساختہ اصولوں کی پابند ہوتی، تو اُس کا وجود ہی ـــــ مٹ چکا ہوتا ـــــ یہ تو وہ جبلی جذبہ ہے، جو ازل سے ابد تک قائم رہتا ہے، زمانے کے اقتدار کے ساتھ ساتھ ـــــ اس کے روپ اور انداز تو ضرور بدلتے رہے ہیں۔ لیکن اس جذبے کا حیاتی پہلو کا جہاں تک تعلق ہے، وہ وہی ہے۔ جو دنیا کے پہلے انسان کا تھا، یا آخری انسان کا ہوگا۔

اور کل شام ـــــ

مجھے اپنے دل میں پلتی ہوئی محبت کا شدت سے احساس ہوا تھا

اتنا سچا ——— اتنا لطیف ——— اتنا گہرا جذبہ ——— میرے دل میں پہلے کبھی نہ اُبھرا تھا ——— اپنی ناقابلِ تسخیر چاہت کا اندازہ تو مجھے کل ہُوا تھا ——— تمام دن اِنھیں خیالوں میں گزر گیا ———

اور اب دن ڈھل چکا تھا ———

اور شام شروع ہی شعلے کی طرح بھڑک اٹھنے کے بعد ——— رفتہ رفتہ پُرسکون ارغوانی چمک میں بدلی ——— اور زرد اور دُھندلی ہوتی ہوئی ——— پگھلتی اور جھلملاتی ہوئی رات میں تحلیل ہوگئی ہے۔

○

۲۸- اگست ۱۹۵۵ء

اُن سے ملے تین چار روز گزر گئے ہیں۔ خوشی اور فتح کی وہ مسرّت اب کچھ کم ہو چلی ہے۔ اُس کی جگہ انجانے اندیشوں اور وسوسوں نے لے لی ہے۔ سوچتی ہوں —— خوشیاں مجھے کبھی بھی راس نہیں آئیں— کہیں ایسا نہ ہو—— کہ یہ مسرّت بھی چھن جائے —— اس خیال سے ہی دل کانپ اُٹھتا ہے۔

خدا نہ کرے —— خدا نہ کرے ——

دراصل بات یہ ہے، کہ کل مَیں نے پاپا کی نئی شادی کی —— خبر سُنی تھی —— اس وقت سے اب تک مَیں یہ سوچ رہی ہوں، پاپا بھی مرد تھے، —— وہ مرد جنھوں نے میری ماں کو بے موت مار ڈالا۔ اُس عورت کی جان لے لی۔ جو اُس کی خوشیوں کی خاطر —— اپنی آرزوں —— اپنی امنگوں کا گلا گھونٹتی رہی —— اور لب سے کبھی شکوہ نہ کیا، اپنی چاہت، اپنی محبّت میں ذرہ بھر بھی کمی نہ کی۔ خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی ——

اور —— پاپا نے —— اُن کا کفن تک میلا ہونے کا

انتظار نہ کیا، اور شادی رچالی۔ کیا وہ سب کچھ بھول گئے ہیں ---- ممی کو، ممی کی محبت کو --- ان کی خدمت گزاری کو ---- کیا مرد اتنی جلد سب کچھ فراموش کر دیا کرتا ہے ---- اگر ایسا ہے، تو احمر بھی تو مرد ہیں ---- تو کیا وہ بھی مجھے ------

یہ کیسا روگ لگا بیٹھی ہوں میں ---- کیا انجام ہوگا میرا ---- ایک قدم آگے کی طرف بڑھاتی ہوں ---- تو فوراً ہی دو قدم پیچھے ہٹ جاتی ہوں ---- مرد سے ازلی نفرت کا غبار میرے دل و دماغ کو زہر آلود کرنے لگتا ہے ---- یہی چاہتی ہوں ---- اب کبھی کسی مرد کی طرف نہ دیکھوں ---- لیکن ---- احمر کے سامنے آتے ہی میں سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ مجھ پر خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں اپنے آپ تک کو بھول جاتی ہوں۔ بس یاد رہتا ہے کچھ ---- تو یہ ---- کہ احمر میرے قریب ہیں ---- میرے سامنے ہیں ---- میرے سارے ارادے۔ سارے بندھن ---- ریت کی دیوار کی مانند ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں ---- میں کچھ نہیں کر سکتی ---- کچھ نہیں بول سکتی ---- میں کیا کروں ---- میری سمجھ میں نہیں آتا ---- میں جو اتنی سمجھدار ---- اتنی عقلمند ---- اتنی ماہر نفسیات بنی تھی، کہ ہمیشہ دو مردوں کو مشورے دیا کرتی تھی ---- آج اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی ---- اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ راستہ جو میں نے اختیار کیا ہے، ---- مجھے اندھیری اور گہری کھائیوں کی طرف لے جا رہا ہے۔ جہاں ایک بار گرنے کے بعد میں کبھی نہ نکل سکوں گی ---- لیکن اس کے باوجود نہ جانے یہ کون سی کشش ہے

جو مجھے اس راہ پر کھینچے لیے جاتی ہے، اور میں سحر زدہ سی بڑھتی چلی جاتی ہوں
میں آج تک کسی مرد سے یوں بے باکی سے نہ ملی تھی۔ میری زندگی میں احمر سے
پہلے کوئی مرد نہ آیا تھا۔ لیکن جب بھی احمر نے مجھے بلایا، میں یوں اُن کی طرف
بڑھی، جیسے میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہ ہو —— ہمارے معاشرے میں ان
لڑکیوں کو کبھی بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، جو یوں بے تکلفی سے مردوں
سے ملتی پھریں! اس حقیقت سے میں خوب باخبر ہوں —— لیکن پھر بھی
ایسا کر رہی ہوں ——

یہ دیوانہ پن نہیں تو پھر کیا ہے؟

یکم ستمبر ۱۹۵۵ء

مَیں نے اپنے آپ کو حالات کی موجوں کے حوالے کر دیا ہے

محبت کا یہ سیلاب ـــــ مجھے ایک تنکے کی مانند بہائے لیے چلا جا

رہا ہے، اور مَیں رُکنے کی کوشش کے باوجود نہیں رُک سکتی ـــــ

نہیں ٹھہر سکتی ـــــ ہاں ـــــ آج مَیں اعتراف کیے لیتی ہوں، کہ

مَیں احمر کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی ـــــ

مَیں اُن سے مِلے بغیر نہیں رہ سکتی!

مَیں انھیں دیکھے بنا نہیں جی سکتی ـــــ

اب چاہے جو بھی ہو! میں تو اپنی زندگی داؤ پر لگا بیٹھی ہوں۔

ہار ـــــ یا ـــــ جیت ـــــ

دونوں میں سے کچھ ہو کر رہے گا ـــــ

یا تو مَیں زندگی کی تمام رعنائیوں ـــــ تمام مسرّتوں ـــــ اور

تمام بہاروں کو اپنے دامن میں سمیٹ لوں گی ـــ

یا پھر ـــــ

اُن صحراؤں کی جانب چل نِکلوں گی!

جہاں کسی درخت کا سایہ نہیں ——

جہاں کوئی پھول نہیں کھلتا ——

جہاں —— کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ——

مَیں اپنی ناکام محبت کو اپنے سینے میں چھپائے —— اُن ویران راستوں کی جانب چل پڑوں گی۔ جو کسی منزل تک نہیں پہنچتے۔

اب تو!

دیکھنا صرف یہ ہے، کہ احمر مجھے دیتے کیا ہیں؟

سدا بہار پھولوں کے ہار ——

یا —— ایسے نوکیلے کانٹے —— جن کی خلش زندگی سے بے زار کر دے۔

اور اب جبکہ مَیں اپنی کشتی لہروں کے رحم وکرم کے حوالے کر ہی چکی ہُوں ——

تو پھر ——

آج یہ اندیشہ بھی دل سے نکالے دیتی ہُوں —— کہ آنے والی کل میرے لیے مسرّتوں کے پیام لے کر آئے گی۔

یا —— نفرتوں کے زہر کے جام!

اور مَیں آج یہ عہد بھی کیے لیتی ہوں —— کہ اِن —— دونوں چیزوں میں سے —— مجھے جو کچھ بھی ملا۔ مَیں اسے بخوشی قبول کر لوں گی —— اور ان تمام تکلیفوں —— تمام اذیّتوں

کو برداشت کر لُوں گی ——— جن کے بن مانگے ملنے کا اندیشہ مجھے ستا تا رہتا ہے۔

آج جب میں اُن کے کمرے میں داخل ہوئی تھی، تو میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہُوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں میں پرانی شناسائی اور گہری رفاقت کی چمک لہرائی —— اور میں سب کچھ بھُلا بیٹھی —— سچ مچ —— میں ان کی اس مقناطیسی کشش کا مقابلہ نہیں کر سکتی —— ان کے سامنے آتے ہی میں اپنے آپ کو بھُلا بیٹھتی ہُوں —— اُن کی شخصیت مجھ پر حاوی ہو جاتی ہے ——— اُن کے سامنے مجھے یُوں لگتا ہے، جیسے میں ایک حقیر اور بے معنی شے ہوں، اور جو کچھ ہیں —— وہ احمر ہی ہیں۔ میں لاشعوری طور پر اُن کی ہر بات، ہر عادت کو قبول کرتی چلی جا رہی ہُوں —— وہ جس انداز میں بات کرتے ہیں، ویسے ہی میں کرنے لگی ہُوں۔ آج جب کسی بات پر ہنستے ہُوئے میں نے اپنے نچلے ہونٹ کے ایک کونے کو دانت تلے دبا لیا، تو مجھے فوراً ہی خیال آیا —— احمر بھی ایسے ہی ہنستے ہیں —— باتوں میں مزاح کی چاشنی —— اور کبھی کبھی طنز کی ہلکی ہلکی ترشی —— میری باتوں میں بھی کچھ ایسا ہی رنگ جھلکنے لگا ہے —— آج ان کی میز پر ایک ضخیم ناول "اداس نسلیں" رکھا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگے —— میرے خیال میں عبداللہ حسین کا یہ ناول دنیا کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے اُردو ادب میں ایسے بلند پایہ ناول بہت کم دستیاب ہوتے ہیں ——— میں ان کی باتوں کو بغور سنتی رہی ——— اور واپسی پر پہلا کام ہی یہ کیا، کہ لائبریری سے وہ ناول لیا۔

اور اب ———

اِس وقت بڑے شوق سے مطالعہ کرنے بیٹھی ہوں — کہ یہ میرے احمر کی پسند ہے ———

مَیں چاہتی ہوں، — کہ مَیں وہ تمام باتیں —— وہ تمام چیزیں، وہ سارے رنگ —— وہ ساری خوشبوئیں جان جاؤں، اور اپنے اندر سمو لوں، جو احمر کو پسند ہیں ———

اور ———

ان تمام چیزوں کے قریب بھی نہ جاؤں — جو انھیں ناپسند ہیں۔ جیسے مَیں نے احمر کو چاہا ہے —— ایسا بہت کم عورتوں نے کسی کو چاہا ہوگا —— اگر آج وہ مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں، تو مَیں سب کو چھوڑ چھاڑ اُن کے ساتھ چل پڑوں گی —— مَیں ان کے ساتھ رُوکھی سوکھی کھا کر —— اور جھونپڑی میں رہ کر یہ سوچوں گی —— کہ یہ میرے لیے دُنیا کی اعلیٰ ترین نعمت ہیں —— اگر اُن کی آنکھوں میں پیار کے چراغ جلتے دیکھوں —— اگر میرا دامن اُن کے پیار کے پھولوں سے بھرا رہے —— اگر ان کے مضبوط ہاتھوں کا سہارا مجھے میسّر رہے، تو مَیں آرام و آسائش کی سب چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گی۔ — اگر ان کی رفاقت سب مجھے میسّر رہے —— تو مَیں دنیا کی ہر تکلیف کا مقابلہ کر سکتی ہوں — ہر آفت کا سامنا کر سکتی ہوں — یہاں تک کہ مَیں اُن کی خوشی کے لیے اپنی جان تک دے دینا ایک معمولی سی بات سمجھتی ہوں ———

اور کیا یہ میری محبّت کی انتہا نہیں ——

سچ تو یہ ہے، کہ ——

اتنا سب کچھ کہہ دینے کے باوجود میں یوں محسوس کرتی ہوں،
جیسے میں اپنی اس محبت —— اس چاہت کے پچاسویں حصّے کو بھی ظاہر
نہیں کر پائی —— جو میرے دل میں اُمنڈ رہی ہے —— اور جس نے مجھے
اس حد تک پاگل بنا دیا ہے —— کہ میں —— اپنے لیے بھی کچھ
نہیں سوچ سکتی !!

○

۱۰- ستمبر ۱۹۵۵ء

چودھویں کا پورا چاند نیلے آسمان پر جگمگا رہا تھا —— اور آسمان سے لے کر زمین تک —— ہر چیز —— سونے میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

شروع رات کا پورا چاند پیچھے سے طلوع ہو کر —— اب بالکل آسمان کے وسط میں آگیا تھا —— اور ننھے سے سنہرے طشت کی مانند جگمگا رہا تھا —— اور اس کی نورانی اور ٹھنڈی کرنیں —— میرے دل میں سوئے ہوئے جذبات کو جگا رہی تھیں —— اس لمحے کائنات کس قدر حسین تھی۔

یوں لگتا تھا!

جیسے ساری دنیا کا حسن یہاں سمٹ آیا ہو ——

اور اس میں شک بھی کیا ہے —— میرا چاند بھی —— تو میرے پہلو میں تھا نا ——

ہم اس وقت فراز کی گاڑی میں —— شہر کے ایک ویران علاقے میں آگئے تھے —— اور اُس دن کی طرح آج بھی فراز ہمیں

تنہا چھوڑ کر کہیں نکل گیا تھا۔

اور میرے دل و دماغ پر وہ چھائے ہوئے تھے!

اُن کے بازوؤں کا لمس ——

اُن کے سانسوں کی گرمی ——

اُن کی باتوں کی ملائمت ——

یہ سب مل کر ایک کیف پرور ہیجانی جذبے کو جنم دے رہی ہیں۔

اور مَیں —— اُن کے سینے میں چہرہ چھپائے سحر زدہ سی نیم دراز ہُوں اُن کے گریبان کے اگلے دو بٹن کھُلے ہیں —— اور نیچے کی سفید بنیان کے کھلے گلے میں سے ان کے سینے کے چھوٹے چھوٹے سیاہ بال دکھائی دے رہے ہیں —— اور جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر مَیں نے اُن کے سینے کی سرخ و سفید جلد پہ ہونٹ رکھ دیے ہیں۔

یہ میری زندگی کا عظیم ترین لمحہ ہے!

مَیں اس وقت بہت خوش ہُوں —— اور اس بے پناہ خوشی نے مجھے گنگ کر دیا ہے۔

ہر شے ساکن ہے ——

سراپا سکوت ——

یُوں جیسے —— اگر ذرا بھی آہٹ ہوئی، تو کوئی بڑی انمول شے ٹوٹ جائے گی، —— کوئی بڑا ہی خوبصورت خواب —— بکھر جائے گا!

یہ تو اکثر ہوا ہے، کہ ——

ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے رہے ہیں، ان کی ہر جنبش —— ہر ادا —— دیکھنے کا انداز ہی مجھے اپنا مفہوم سمجھا دیتی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے کچھ کہے سُنے، بنا ہی —— ایک دوسرے کی بات سمجھ جاتے ہیں۔

—— لیکن —— کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے، —— کہ وہ مجھ سے باتیں کریں ——

محبت کی باتیں ——

پیار کی باتیں ——

اپنی باتیں ——

میری باتیں ——

اب یہ بھی کتنی عجیب بات ہے، کہ انھوں نے کبھی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا —— کبھی اپنی وفا کا یقین نہیں دلایا —— کبھی یہ نہیں کہا، کہ میں اُنھیں اچھی لگتی ہُوں —— اور میں یہ سب کچھ اُن کے ہونٹوں سے سُننے کی خواہش مند ہُوں۔ لیکن اب یہ میں ان سے کیسے کہوں؟

اُن کی محبت کا اظہار —— دنیا کے لوگوں سے انوکھا ہے۔

اب تک میں نے کتابوں میں کچھ اور ہی پڑھا تھا —— اور پھر میری سہیلیاں بھی تو بتاتی تھیں، —— کہ اُن کے محبوب اُنھیں یقین

دلانے کے لیے کیسے کیسے لفظوں کا سہارا لیتے ہیں ___ لیکن ___ احمر نے تو یہ سب کچھ نہیں کیا ___ بس وہ تو بانہوں میں لے کر مجھے اپنے سینے ___ سے بھینچ لیتے ہیں ___ اور پھر ان کے ہونٹ ___ میرے بالوں ___ میری گردن ___ ہونٹوں ___ اور رخساروں پر ___ اَن گنت پھول رکھ دیتے ہیں۔ ان کی ہر ادا ___ ہر جُنبش ___ میرے اِس یقین کو اور پختہ کر دیتی ہے، کہ وہ مجھے چاہتے ہیں، مجھ سے محبت کرتے ہیں ___

لیکن پھر بھی میرا جی چاہتا ہے، کہ وہ اپنے ہونٹوں سے ___ میرا نام بار بار لیں ___ مجھے اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے لفظوں کا سہارا لیں ___ جبھی تو اُس وقت جب کہ ہم گاڑی میں بیٹھے رہنے سے اُکتا کر باہر نکل آئے تھے ___ اور وہ ایک ابھرے ہوئے چٹان نما پتھر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے اُن کے شانے کو ہلکے سے چھُو کر پوچھ لیا تھا:

"مَیں آپ کو کیسی لگتی ہُوں؟"

تب وہ کِھلکھلا کر ہنس پڑے، کہنے لگے:

"یہ آپ لڑکیوں کی کتنی عجیب عادت ہے، بس چاہتی ہیں، کہ کوئی ہر دم ان کی تعریفیں کرتا رہے۔"

مَیں جھینپ کر خاموش ہو گئی ___ تو انھوں نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے قریب ہی بٹھا لیا ___ مَیں نے اپنا سر اُن کے شانے پر

رکھ دیا — اور دھیرے سے پوچھا :

" اچھا یہ نہ سہی — یہی بتا دیں — میری کوئی بات آپ کو اچھی بھی لگتی ہے ؟ "

تب وہ فوراً بول اُٹھے :

" بُری کون سی ہے "۔

تو — گویا — اُنھیں میری ہر بات اچھی لگتی ہے — کتنے شریر ہیں یہ بھی — اگر خود یہ کہہ دیں ، تو کیا بگڑ جائے گا — کیسے ہیں یہ — بیک وقت اثبات و نفی کی علامتوں سے کام لے کر اپنی جستجو کرنے والوں کو مغالطوں میں ڈال کر کیسا کیسا لُطف لیتے ہیں۔

مَیں تو پیار کے اِس اُبلتے چشمے سے اپنی رُوح کی ساری تشنگی مٹا دینا چاہتی ہوں ، لیکن کیسے ہیں یہ — جو مجھے پیاسا رکھنا چاہتے ہیں۔

ہاں — اُن کی شخصیت کچھ ایسی ہی ہے۔ سرکش اور ہنگامہ خیز — اِدھر اُدھر کی سوئی ہوئی فضا میں اپنے انوکھے فیصلوں سے ارتعاش پیدا کرنے والی — ان کی تیز رفتاری — سر جھٹکنے کا انداز اور ہنگامہ خیز ہنسی — ان کی ہر ادا سے احساسِ برتری آشکارا تھی۔

انھیں اپنی ہر ہر خوبی کا احساس ہے۔ وہ اپنے حُسن کی قوّت سے پوری طرح باخبر ہیں — وہ اپنی ذات سے بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں —

اِن پر فتح پانا مشکل ہے۔ لیکن مَیں تلاش تو کر دیکھوں —

شاید اُنھیں پالوں۔

واقعی ———

کبھی کبھی وہ بڑا ہی خوبصورت، بڑا ہی شاندار قلعہ معلوم ہوتے تھے۔

خوبصورت — مگر ناقابلِ تسخیر ———

لیکن کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے نا — کہ بڑے بڑے آہنی قلعے

صرف دل کی ایک ——— نرم دستک سے کھُل جاتے ہیں ———

تو شاید ——— کبھی میرا جذبہ بھی اُنھیں فتح کرلے ———

شاید ——— شاید ———

○

۲۸ - ستمبر ۱۹۵۵ء

ٹیلی ویژن کی دنیا ایک رنگین دنیا ہے ——— شام ہوتے ہی یہاں رنگین آنچل لہرانے لگتے ہیں ——— فضا میں قہقہوں اور ہنسی کی جھنکار سنائی دیتی ہے ——— ایوننگ اِن پیرس کی مہک چہار سُو بکھری ہوتی ہے ——— میک اپ سے مزّین حسین چہروں والی لڑکیاں ——— اور سوٹ میں ملبوس سنورے ہوئے نوجوان لڑکے ——— بے تکلفّی سے خوش گپیوں میں مصروف ہوتے ہیں ——— یا اپنے اپنے مکالمے یاد کرتے دکھائی دیتے ہیں ——— یہ سب آپس میں بہت بے تکلّف ہیں ———

اور یہ کسی حد تک ٹھیک بھی ہے ———

جب مِل جُل کر کام کرنا ہی ہے ——— تو پھر تکلّف کب تک قائم رہ سکتا ہے، ان ہی لڑکیوں میں تیکھے نقش و نگار ——— سفید رنگت اور بھرے بھرے جسم والی ایک نوجوان لڑکی انجم ہے۔ جب کبھی اسے کسی ڈرامے میں کردار ادا کرنا ہوتا ہے ——— تو اُن دنوں یہاں کچھ زیادہ ہی چہل پہل ہوتی ہے ——— اور اس کی وجہ

خود انجم کی ذات ہے، —— یہ لڑکی حد سے زیادہ شریر ہے۔
ایک منٹ بھی اس سے نچلا بیٹھا نہیں جاتا۔ ابھی اس کرسی پر
نظر آئے گی، تو چند لمحوں بعد میز پر بیٹھی ہو گی —— ہر ایک پر
طرح طرح کی پھبتیاں کستی رہے گی —— ایک ہنگامہ برپا کرتی رہتی
ہے —— بعض اوقات تو پروڈیوسر بیچارہ پریشان ہو جاتا ہے۔
جب وہ سختی سے کام کی طرف توجہ دینے کے لیے کہتا ہے —— تو چند
لمحوں کے لیے سنجیدہ ہو گئی ——

اور پھر وہی حرکتیں ——

ویسے اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ وہ ایک ذہین آرٹسٹ ہے۔
ہر طرح کی اداکاری بہت خوبی سے کرتی ہے، جبھی تو سب لوگ اُس کی
ہر بات کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔

جب کبھی وہ آتی ہے، تو احمر کی باتوں میں بہت زیادہ دلچسپی
لیتی ہے —— اور احمر بھی تو اس سے خوب گھُل مِل کے ——
باتیں کرتے ہیں، گھنٹوں وہ اُن کے کمرے میں بیٹھی رہتی ہے،
بار بار چائے منگوائی جاتی ہے —— لوگوں کے چہروں کے ——
عجیب و غریب اسکیچز بنائے جاتے ہیں —— اور پھر سب کو
دکھائے جاتے ہیں ——

مجھے یُوں لگتا ہے!

جیسے وہ احمر کو پسند کرتی ہے —— اور یہ مجھے کیوں اچھا

نہیں لگتا۔

احمر — میرے ہیں — اُن پر میرا حق ہے!

میرا جی چاہتا ہے — میں اُنھیں اِن سب کی نظروں سے دُور، کسی ایسی جگہ لے جاؤں، جہاں میرے علاوہ اُنھیں دیکھنے والا کوئی نہ ہو میں اُن کی پرستش کرتی ہُوں — اور اس میں کسی کو شریک کرنا پسند نہیں کرتی! لیکن یہ سب کچھ میں صرف سوچتی ہوں — کسی سے کہہ نہیں سکتی — یہاں کا — ماحول ہی ایسا ہے — کچھ کہا بھی تو نہیں جا سکتا۔

اور احمر ———

کبھی کبھی تو میں اس بات پر حیران رہ جاتی ہُوں، کہ انجم سے گفتگو کرتے وقت بھی اُن کے لہجے میں وُہی چاشنی ہوتی ہے، جیسی کہ میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے میں محسوس کرتی ہوں۔ اُن کی آنکھوں میں میں نے وُہی مسحُور کُن چمک بارہا دیکھی ہے، جب انجم اُن کے پاس ہوتی ہے۔

آخر — آخر یہ سب کیا ہے؟ میرا ذہن اُلجھنے لگتا ہے، میں سوچتی ہُوں — کہ میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھی ہُوں — وہ تبسّم — وُہ تکلّم — کہیں اِن کی عادت ہی نہ ہو —

میرا دل ڈوبنے لگتا ہے!

میں تو یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی، — کہ وہ مجھے نہیں چاہتے۔

وہ میرے علاوہ بھی کسی کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ سکتے ہیں — نہیں نہیں میں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتی — ایک اور عجیب بات میں نے محسوس کی ہے جب کبھی اُن کے کمرے میں کوئی موجود ہوتا ہے۔ تو وُہ مجھ سے اجنبی بنے بیٹھے رہتے ہیں، بات تک نہیں کرتے، اگر کبھی مجبوراً کرنی پڑ ہی جائے تو سرسری سی بات کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے، جیسے وہ نہیں چاہتے کہ ہمارے مراسم کا کسی کو پتہ چلے۔ کبھی کبھی تو یہ اجنبیّت مجھے بہت اذیّت پہنچاتی ہے وہ مجھ سے یوُں بیگانے بنے بیٹھے رہتے ہیں، جیسے جانتے تک نہ ہوں، اور یہ میری برداشت سے باہر ہونے لگتا ہے۔ کتنے معاملہ فہم ہیں یہ — نہیں چاہتے کہ ہم لوگوں کی افواہوں کا مرکز بنیں، لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں جو کسی مصلحت کو نہیں سمجھتا — میری تو سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو چکی ہیں — لیکن احمر — وہ ہر بات کو محسوس کرتے ہیں — سمجھتے ہیں — اور پھر ویسا ہی روّیہ اختیار کرتے ہیں — لیکن میرے لیے اُن کی چند لمحوں کی بیگانگی بھی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ میرا دل بوجھل ہو جاتا ہے — اور آنسو پلکوں کے کناروں سے چھلکنے کو بے تاب ہو جاتے ہیں — پھر مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں جاتا۔ میں بوجھل دل لیے وہاں سے اُٹھ جاتی ہوُں۔

—لیکن—

جب کبھی احمر تنہا ہوتے ہیں — تو اُن کی آنکھیں مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتی ہیں — اُن کی ہر ہر بات سے اپنائیت

چھلکتی ہے —— یوں جیسے میرے اور ان کے درمیان کوئی ——
فاصلہ نہ ہو، جیسے ہم دونوں ایک ہوں ——
تب میں فیصلہ نہیں کر سکتی!
کہ وہ اجنبیت سچّی تھی —— یا یہ اپنائیت ——
وہ کیسے کیسے رنگ بدلتے ہیں —— انھیں پہچاننا ——
کتنا دشوار ہے، —— انھیں سمجھنا کس قدر مشکل ہے —— یہ کوئی
مجھ سے پوچھے!!

○

۱۵۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء

کل رات کے ڈرامے ——"پیار کے رُوپ ہزار"—— میں مجھے ایک اہم کردار ادا کرنا تھا۔

احمر اسے پروڈیوس کر رہے تھے!

وقتِ مقررہ پر —— ہم سب کو احمر کے کمرے میں جمع ہونا تھا —— وہیں ریہرسل کرنا طے پایا تھا۔

جب میں —— کوریڈور سے گزر رہی تھی —— تو احمر کی آواز مجھے سُنائی دی۔

وہ کہہ رہے تھے:

"ارے رہنے دیجیے، مس انجم —— اب اعتراف کر ہی ڈالیے، —— کہ یہ سوئیٹر —— آپ نے لنڈا بازار سے خریدا ہے۔"

مَیں نے دروازہ کھولا ——

میری نظر انجم پر پڑی —— وُہ احمر سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی —— اپنے سوئیٹر کا کالر پلٹ کر وُہ لیبل دکھا

رہی تھی ـــــ جس پر میڈ اِن انگلینڈ لکھا تھا ـــــ اُس کا ریشمی نما دوپٹہ جھول کر بائیں بازو پر آپڑا تھا، اور وُہ مصنوعی غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہی تھی :

کہ ـــ سوئیٹر اُس کے کزن انگلینڈ سے لائے ہیں !

لیکن ، احمر اُسے ستا ستا کر لُطف لے رہے تھے ـــــ اور مُصر تھے کہ سوئیٹر ضرور لنڈا بازار سے خریدا گیا ہے ۔

مجھے دیکھتے ہی ـــــ انجم میرے قریب آ گئی ـــــ اور لیبل دکھاتے ہوئے بولی :

" لو تم خود دیکھ لو بینا ـــــ یہ کہاں کا ہے ؟ "

" ارے ـــــ انھیں کیا دکھاتی ہو ـــــ آج کل لنڈا بازار میں اتنے عمدہ عمدہ سوئیٹر آئے ہوئے ہیں ، کہ انھیں ایک بار صرف میں دھو کر پہن لیا جائے ، ـــــ تو یہی معلوم ہوتا ہے ، کہ کسی کے کزن نے پریذنٹ دیا ہے ـــــ اچھا چلو ـــــ مان لیتے ہیں ، ـــــ کہ یہ آپ نے لنڈا بازار سے خریدا ہے ۔ اب صفائی مت پیش کرو ! "

انجم منھ پھلا کر کمرے کے درمیان میں رکھی ہوئی گول میز پر بیٹھ گئی ـــــ یہ اس کی ایک نرالی عادت ہے ، ـــــ کہ ہمیشہ آ کر میز پر بیٹھے گی ۔

کمرے کا دروازہ کھُلا ـــــ شہاب نے کمرے میں جھانک کر

انجم کے بارے میں پوچھا۔

احمر میز کی طرف اشارہ کر کے بولے :

"وہ دیکھیے میز پر رکھی ہیں۔"

شہاب ہنس پڑے۔ انجم سے کہنے لگے :

"آپ اِس ڈرامے کا کانٹریکٹ سائن کر دیجیے۔"

وہ دونوں کمرے سے چلے گئے —— تو احمر مجھے ایک کاغذ دکھاتے ہُوئے بولے :

"یہ دیکھیے کیسا ہے ؟"

کاغذ پر سرخ پنسل سے دو ہونٹ بنائے گئے تھے۔ اس سے کچھ اُوپر سیاہ رنگ کی پنسل سے آنکھیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ بڑی مہارت سے بنائی گئی تھیں، اور بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں لیکن میری آنکھوں کے سامنے تو چند لمحے پہلے کا منظر رقص کر رہا تھا، جب انجم انھیں کالر ملٹ پلٹ کر دکھا رہی تھی۔ اُس وقت احمر کتنے خوش تھے۔ اسے تنگ کر کر کے کیسا لطف لے رہے تھے! میرا ذہن پراگندہ ہو رہا تھا بے خیالی میں مَیں نے کاغذ اٹھایا، اور چاہا کہ چند لمحے باہر کی فضا میں اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کر آؤں —— جیسے ہی مَیں نے کمرے کا —— دروازہ کھولا —— وہ بولے :

"مِس بینا —— یہ تصویر مَیں نے آپ کو دی نہیں ہے۔"

مَیں نے جھینپ کر کاغذ واپس اُن کی میز پر رکھ دیا، اور

باہر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔

وہ پھر شرارت سے مسکرائے، ــــ بولے:

"اب یہ کچھ اتنا ضروری بھی نہیں ہے، کہ آپ اتنی جلد واپس چلی جائیں۔"

مَیں نے نگاہیں اٹھا کر ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

اُف ــــ اس لمحے وہ کِتنے مسرُور تھے۔ شرارت ان کے انگ انگ سے پھُوٹی پڑتی تھی ــــ اور وہ میرے دل میں برپا تلاطم سے کس قدر بے خبر تھے!!

○

۲۵ر نومبر ۱۹۵۵ء

موسم بدل چکا ہے —— اگست کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا کی جگہ ٹھٹھری ہوئی برفانی ہوا نے لے لی ہے، خزاں نے بہار کی رنگینی اور شادابی چھین لی ہے۔ پھول مرجھا گئے ہیں —— اور کہیں کہیں درختوں پر لگے ہوئے زرد پتّے اپنے فنا ہو جانے کے خوف سے کانپ رہے ہیں، آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں —— روشنی کی ایک کرن بھی کہیں نظر نہیں آتی —— اندھیرا ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

آج شام — مجھے احمر سے ملنا ہے ——

اور مَیں سوچ رہی ہوں —— کہ کہیں برسات شروع نہ ہو جائے —— لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے —— موسم کا یہ تغیّر و تبدّل میرے ارادے کو نہیں بدل سکتا۔ ان سے ملنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا —— اور پھر یہ —— چھوٹی چھوٹی پریشانیاں اور اُلجھنیں تو قدم قدم پر ہمارے ساتھ —— رہتی ہیں —— اگر ہم ان سے مغلوب ہونے لگیں، تو زندگی میں

کچھ نہ کر پائیں ـــــ جدوجہد ـــــ اور پریشانیوں سے اُلجھنے کا نام ہی تو زندگی ہے۔

شام کے چھ بجے مجھے ہوسٹل کی پچھلی جانب ـــــ فراز کی موٹر کا مخصوص ہارن سُنائی دیا ـــــ یوں تو مجھے آٹھ بجے اسٹیشن پہنچنا تھا ـــــ لیکن میں نے کچھ ضروری چیزیں خریدنے کا بہانہ بنا کر بیگم اختر سے اِس وقت جانے کی اجازت لے لی ہے۔ ویسے بھی جب سے میں نے تعلیم مکمل کر لی ہے، بیگم اختر میرے مُعاملات میں بہت کم بولتی ہیں ـــــ اور پھر وہ مجھ پر اعتماد بھی تو کتنا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی تو میں شرم سے ان کے آگے آنکھیں نہیں اٹھا سکتی ـــــ میں اُن کے اعتماد کا کِتنا غلط استعمال کر رہی ہُوں ـــــ میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگتا ہے ـــــ لیکن میں اپنی اس اندھی محبت کے آگے بے دست و پا ہو کر رہ جاتی ہُوں ـــــ

میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتی ـــــ

نہیں روک سکتی ـــــ

باہر ہارن تھوڑے وقفے کے بعد بج رہا ہے۔ میں نے سیاہ شال اپنے شانوں پر لپیٹا ـــــ اور باہر نکل آئی ـــــ

ہوا کِسی وحشی کی مانند شیشوں سے سر ٹکرا رہی تھی ـــــ فراز نے کھڑکیوں کے سب شیشے چڑھا دیے تھے ـــــ لیکن اس کے باوجود ٹھنڈک سے جسم کپکپا رہا تھا ـــــ اور میں احمر کے بارے

میں سوچ رہی تھی ۔

انھوں نے چھاؤنی کے اُس دوراہے پر ملنے کو کہا تھا —— جہاں سے ایک سڑک شہر کی جانب نکلتی ہے، اور دُوسری چھاؤنی کی طرف مُڑ جاتی ہے ——

مَیں نے کلائی کی رسٹ واچ پر نظر ڈالی —— سوا چھ بج چکے تھے۔ لیکن اندھیرا یُوں بڑھ گیا تھا۔ جیسے آدھی رات —— گزر چکی ہو ——

موٹر چھاؤنی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی ——

مَیں سنبھل کر سیٹ پر بیٹھ گئی —— اور ویران سڑک کا جائزہ لینے لگی —— لیکن سڑک ویران تھی ۔ دُور دُور تک کسی کا نشان نہ تھا۔ یہ سڑکیں ویسے بھی آمدورفت کے لیے بہت کم استعمال ہوتی تھیں۔ کیونکہ یہ شہر کا ایک غیر آباد علاقہ تھا —— اور آج تو سردی ایک دم بڑھ جانے کی وجہ سے شاید کوئی گھر سے باہر ہی نہ نکلا تھا —— لیکن میرے دل میں اُن کے قُرب کی تمنّا انگارے کی مانند دہک رہی تھی —— اور خوشی کے اُس احساس سے میرا چہرہ دمک رہا تھا۔ جو مجھے ابھی ملنے والی تھی —— لیکن مسرّت بے نیاز ہوتی ہے —— ہر شے سے —— آنے والی اور گزری ہُوئی کل —— ان دونوں سے بھی —— مسرّت ماضی کو بھلا دیتی ہے —— اور مستقبل کے بارے میں بھی نہیں سوچتی۔ یہ صرف حال کو جانتی ہے —— ایک دن کو نہیں —— بلکہ صرف

ایک لمحے کو ــــــ

میں پارے کی طرح مضطرب اور بے قرار تھی ــــــ میری محبت اپنی ساری صداقتوں کے ساتھ اُن کے لیے چشم براہ تھی۔ میری متلاشی نگاہیں اُنھیں ڈھونڈ رہی تھیں ــــــ اور وقت لمحہ لمحہ، پل پل کرکے گزرتا جارہا تھا ــــــ!

اور سڑک اب تک ویران تھی ــــــ

اس وقت میں نا اُمید بھی تھی ــــــ اور پُر امید بھی ــــــ

اور یہی وقت بوجھل دل ودماغ پر بھاری ہوتا ہے ــــــ اور یہی وقت زندگی اور موت کے درمیان کے فاصلے کو کم کر دیتا ہے ــــــ انتظار کی یہ اذیّت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے۔ وقت تھم تھم کے گزرتا چلا جارہا تھا ــــــ گھڑی کی سُوئیاں سات بجانے کا اعلان کررہی تھیں ــــــ

لیکن ــــــ احمر کہاں تھے؟

وہ نہیں آئے ــــــ

وہ نہیں آئیں گے ــــــ

مایوسی اور نااُمیدی کے احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں ــــ یہ پہلے آنسو تھے ــــ جو اُن کی جدائی میں بہے تھے۔ جن کا لمس میری آنکھوں نے اِس وقت محسوس کیا تھا ــــ جو دل سے دُھواں بن کر اُٹھے تھے، اور میری پژمردہ آنکھوں کو سینچ گئے تھے۔

میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ رہی تھی ـــــ لمحوں کی خاموشی سالوں پر محیط ہونے لگی تھی ـــ اور میں بے دلی سے شام کے، رات ہونے کا بیزار کن عمل دیکھ رہی تھی ـــ ایک ایک لمحے کو وقت کے سمندر میں گرتا دیکھ رہی تھی ـــ اور رات گہری، ٹھنڈی، اُداس اور اکیلی ہوتی گئی۔ بوجھل اور تھکی ہوئی ہوائیں میرے شانوں پر جھک کر آہیں بھرنے لگیں ـــ مغرب کی جانب سے بادلوں کی سیاہ دیوار اُوپر اور اُوپر کی جانب بڑھتی گئی ـــ اور یہ اندھیرا میرے دل و دماغ پر مسلّط ہوتا گیا۔ میرے دل کے دہکتے ہوئے جذبوں پر مایوسی اور ناکامی کی راکھ ـــــ دبیز اور دبیز ـــ ہوتی گئی ـــ میرا دل نیم کی طرح تیز کڑواہٹ سے لبریز تھا ـــ ہر سمت خزاں کے اندھیرے کی طرح کوئی بیزار کن اور اذیّت ناک سایہ بڑھتا چلا جا رہا تھا ـــ میرا دم گھٹنے لگا تھا ـــ اور میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، کہ اس تاریکی اور تلخی سے کیسے جان بچائی جائے ہر جذبہ ـــ ہر احساس ـــ انتظار کی بوجھل زنجیر میں جکڑا ہُوا تھا۔ کبھی اسی جگہ میری اور احمر کی جوان قربتوں نے ـــ چاندنی کا نکھرتا حسن دیکھا تھا ـــ اندھیروں کی دلکشی جانچی تھی ـــ فضاؤں کے مترنم گیت سُنے تھے ـــــ

لیکن آج یہ سب کتنا بدلا بدلا تھا ـــــ

آج آسمان تاریک تھا ـــ کہیں کوئی ٹمٹماتا ستارہ تک نہ تھا۔ ہنستی اور مسکراتی بہار نے خزاں کا روپ دھار لیا تھا ـــ صبح کے

اُجالوں کا نُور چھن چکا تھا —— اور آج یہ دنیا مجھے ایک بھیانک —— اُجاڑ اور چٹیل میدان کی طرح لگ رہی تھی۔ جہاں نہ چاند چمکتا ہے، نہ طلوعِ آفتاب کی جھلکیاں ہیں —— اور نہ شفق کی رنگینیاں ہیں —— جہاں زندگی صحرا کے تنہا اور جھلسے ہُوئے درخت کی مانند ہے، جسے بادِ سموم پنپنے نہیں دیتی۔ جہاں بگولے اُٹھتے ہیں —— اور ویرانی چیخیں مارتی ہے —— آج زندگی کتنی دُکھی —— پھیکی —— اور —— بے کیف ہو گئی تھی —— آج شب و روز کی گردش کس قدر بے معنی لگ رہی تھی، —— ساری فضا سوگوار تھی —— درخت اندھیرے میں ڈوبے ہوئے آسیب زدہ معلوم ہو رہے تھے —— اور میرے دل پر جیسے کسی نے وزنی پتھر رکھ دیا تھا ——

اور سڑک اب تک ویران تھی ——

دُور دُور تک کوئی نہ تھا —— گھڑی کی سُوئیاں —— آٹھ بجا رہی تھیں —— اگلی سیٹ سے مُڑ کر فراز نے میرے چہرے کی طرف دیکھا، اور پوچھا :

"احمر تو اب نہ آئیں گے —— کیا واپس چلیں ——؟"

مَیں نے گردن جھکا کر اثبات میں سر ہلایا۔

انتظار کی یہ آگ جس میں مَیں جل رہی تھی —— مجھے کیا حق تھا کہ مَیں فراز کو بھی اُس میں دھکیلتی رہُوں —— یہ دُکھ میرا دُکھ تھا —— یہ اذیّت میری اپنی تھی —— مَیں کب تک

فراز کو انھیں سڑکوں پر بھٹکتا دیکھتی رہتی ———

دو گھنٹے گزر چکے تھے ———

دو گھنٹے ———

دو صدیاں ——

اور اب میری آنکھوں میں ناکامی کا غبار گہرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ ہونٹ اُس جل تھل ندیا کی مانند تھے، جو چشم زدن میں سُوکھ کر دھرتی کا پیاسا ہونٹ بن گئی ہو ——— اور چہرے پر —— مایُوسی راکھ بن کر اُڑ رہی تھی ———

۲۷- نومبر ۱۹۵۵ء

رات بھر میں ذہنی انتشار کے عروج مقام پر رہی ہوں —— یہ خیال ایک زہریلے ناگ کی مانند مجھے بار بار ڈستا رہا —— میرے ذہن میں زہر گھومتا رہا ——

احمر نہیں آئے ——

انھیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ——

اگر انھیں مجھ سے پیار ہوتا، تو وہ ہر رکاوٹ —— ہر مشکل —— ہر مجبوری کو عبور کر کے مجھ سے ملنے آتے ——

کہ محبّت ——

اِن سب سے بالاتر ہے!

اور پھر ——

مجبوری بھی مرد کے لیے تو مجبوری نہیں رہتی ——

میرا ذہن بار بار مشورہ دیتا ہے —— آگ سے —— کھیلنا چھوڑ دو ——

آگ سے —— کھیلنا چھوڑ دو ——

لیکن کیسا المیہ ہے یہ —— کہ انسان کو زندگی ملی ہے —— عقل ملی ہے —— خواہش ملی ہے —— لیکن وہ مجبور ہے۔ جو چاہے وہ کر نہیں سکتا۔ اُسے نہیں معلوم ہوتا، کہ آنے والا لمحہ اپنے جلو میں کیسا ہیبت ناک طوفان لائے گا، جو زندگی کو شاہراہِ حیات کے کسی خطرناک موڑ پر کھڑا کر دے گا —— جب وہ جینا نہیں چاہتا —— تو جینا پڑتا ہے —— جب زندگی کی آرزو کرتا ہے —— تو زندگی رُوٹھ جاتی ہے۔ جب مسرّت کے حصُول کے لیے آغوش وا کرتا ہے تو غموں کے ڈھیر اُس کی جھولی میں آن گرتے ہیں۔

کتنا بے بس ہے انسان ——

کچھ نہیں کر سکتا ——

آنے والے واقعات پر اُس کا کوئی بس نہیں چلتا۔

اچانک میرے خیالات کی رو نے راستہ بدل لیا ——

مَیں سوچنے لگی :

ممکن ہے —— وہ بیمار ہوں —— اُنھیں کوئی حادثہ پیش آگیا ہو —— ورنہ اس سے پہلے تو اُنھوں نے کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ اس خیال نے میری بے قراری —— میری بیتابی میں اور اضافہ کر دیا۔ خدا کرے وُہ خیریت سے ہوں۔ مَیں دل ہی دل میں اُن کی سلامتی کی دُعائیں مانگنے لگی ——

ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے گزری ——

صبح ہوتے ہی مَیں نے چائے کا ایک کپ پیا اور اُن کے آفس کی طرف چل پڑی۔

انجانے اندیشوں اور وسوسوں سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مَیں نے اُن کے کمرے کا دروازہ کھولا ـــ سامنے وہ بیٹھے تھے۔ ہمیشہ کی طرح تر و تازہ اور ہشاش بشاش ـــ میری جان میں جان آئی ـــ مَیں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

مَیں آگے بڑھی ـــ اور اُن کی میز کے قریب ہی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی ـــ

"آپ خیریّت سے تو ہیں نا" ـــ عجیب بے قراری کے ساتھ میرے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ نکلے۔

پل بھر کے لیے ـــ اُن کا چہرہ تمتما اُٹھا ـــ کان کی لویں سُرخ ہو گئیں نظریں جھکا کر بولے :

"جی ہاں ـــ بالکل ٹھیک ہُوں!"

میرے جی میں آیا، مَیں اُن سے کہُوں :

تم جو اتنے عظیم ہو ـــ اتنے شاندار ہو ـــ تم نے یہ سب کیوں کیا؟ ـــ کیا تم اُن لمحوں کی اذیّت محسوس کر سکتے ہو، جن سے کل مَیں گزر کر آئی ہُوں ـــ جب میرا ذہن شعلوں کا آتش کدہ بن گیا تھا ـــ اور مایُوسی کا طُوفاں ـــ میری تمام ہمّتیں ـــ سارے عزم ـــ اور ساری جُرأتیں بہا کر لے گیا تھا،

اور میرے پاس کچھ نہ بچا تھا —— کبھی کبھی تم کتنے لاپرواہ —— خود غرض —— اور —— بے رحم بن جاتے ہو احمر! —— تم نے تو شاید یہ سوچا تک بھی نہ ہو —— کہ انتظار کے عالم میں میں کیسی جان کنی کی سی کیفیت میں مبتلا تھی ——

وُہ اذیّت ——

آہ —— وُہ اذیّت ——

مَیں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی ——

تم نے ایسا کیوں کیا —— ؟

کیوں کیا احمر! —— ؟

تم نے مجھ سے وہ مسرّت کیوں چھین لی احمر! —— جس کی مَیں مستحق تھی ——

لیکن مَیں چُپ رہی ——

کہ —— اُن سے استفسار کرنا —— اُنھیں کھو دینے کے برابر تھا۔

اور مَیں اُنھیں کھونا نہیں چاہتی تھی ——

کسی قیمت پر نہیں ——

اپنی زندگی ہار کر بھی نہیں ——

مَیں خاموش رہی ——

اُس آتش فشاں کی طرح، جس کے سینے میں لاوا پکتا ہے۔

لیکن جب تک پہاڑ کی چھاتی نہیں پھٹتی۔کسی کو پتہ نہیں چلتا۔

مَیں ساکت تھی ــــــ

اُس گہرے سمندر کی طرح ــــــ جس کے دل میں طوفان ــــــ مچلتے ہیں اور سطح ساکن رہتی ہے!!

شاید مجھ میں ــــــ میرے جذبے ــــــ میں ہی کوئی کمی رہ گئی تھی ــــــ جو مجھے اُن کی ــــــ رُوح سے ــــــ ہم آہنگ نہ ہونے دیتی تھی ــــــ

وُہ خاموش تھے ــــــ

اجنبیّت ہمارے درمیان ایک اَن دیکھی ــــــ خلیج کی طرح حائل تھی ــــــ آج اُن کے چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی ــــــ ہمیشہ کی خوش گفتاری آج اُن کا ساتھ نہ دے پا رہی تھی ــــــ

اور ــــــ مَیں ــــــ

مَیں اس وقت اپنے ہی بے ثمر خیالوں میں ــــــ اُلجھی ہوئی تھی۔ میرا غیر متوازن ذہن ــــــ میری سوچنے، سمجھنے ــــــ اور گفتگو کرنے کی تمام صلاحیّت چھین چکا تھا ــــــ

اپنے ہی ــــــ خیالات کی یلغار سے ــــــ گھبرا کر ــــــ

مَیں اُٹھ کھڑی ہُوئی ــــــ

اور دبے لہجے میں کہا :

"مَیں جا رہی ہُوں" ــــــ

"کیسے آنا ہُوا تھا؟"

وُہ بڑی کوشش سے بولے۔

"صرف آپ کو دیکھنے —— کہ آپ خیریّت سے تو ہیں نا——؟"

مَیں نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں جواب دیا۔

اور تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آئی ——

○

۳۰- نومبر ۱۹۵۵ء

کوئی حادثہ رُونما نہ ہوا تھا — کوئی رکاوٹ اُن کی راہ میں حائل نہ ہوئی تھی — لیکن اس کے باوجود وہ مجھ سے ملنے نہ آئے تھے — یہ تکلیف دہ خیال پھانس بن کر میرے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ جس کی کسک، جس کی خلش مجھے چین لینے نہ دیتی تھی ——

مجھے یوں لگ رہا تھا — کہ پیار — میرا خلوص — میری محبت — اکیلا پیار — اکیلا خلوص — اور اکیلی محبت ہے۔ جو انتہائی نازک راہوں پر بھٹک رہی ہے، اور جس کا دل بُری طرح مرجھا چکا ہے۔

اُنھیں مجھ سے زیادہ اپنی ذات سے پیار ہے۔ اُن میں جاں نثاری کا جذبہ بالکل مفقود ہے — یہ مَیں جان چکی ہوں — لیکن — یہ کیسی مجبوری ہے، جسے محبت کہتے ہیں — جسے محبت نہیں ہونا چاہیے، اور جو محبت ہے ——

یا خدا — عشق کا جواب، عشق کیوں نہیں ہوتا — یہ کیسی آگ ہے، جو ایک کو جلاتی ہے — اور دُوسرے کے دل میں برف کی سِل بن جاتی ہے۔

کیا میں محبت کو وہ خانہ بدوش قافلہ خیال کر لوں —— جس کی گھنٹیوں کی آواز —— صحرا کی چاندنی راتوں میں تھوڑی دیر کے لیے گونجتی ہے، اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔

میں اس وقت اپنی بساط سے بڑھ کر اداس ہوں —— یہ دُنیا کتنی وفا نا آشنا ہے —— میرا جی چاہتا ہے، کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی ویرانے میں جا بسوں —— ورنہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔

انسان جب زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ تو درد اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلتا ہے، اور اِن زخموں کے لیے آنسو ہی سب سے زیادہ مفید مرہم کا کام دیتے ہیں۔

رات کتنی ہی دیر تک، میں تکیے میں منہ چھپائے روتی رہی —— اور میرے آنسو —— تکیے کی نرم نرم روئی میں جا سوئے —— صبح میری آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں —— اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

ناشتے کی میز پر۔ بیگم اختر نے میری متورم آنکھوں کو دیکھ کر —— پوچھ ہی لیا:

"کیا بات ہے بیٹا —— بڑی نڈھال معلوم ہو رہی ہو" ——

میں گھبرا گئی —— کہیں وُہ میرے دل کا حال تو نہیں جان گئیں، جلدی سے بولی:

"نہیں —— کوئی خاص بات نہیں —— ذرا سر میں درد ہے"

اُنھوں نے میرا ہاتھ چھُوا ———

کہنے لگیں :

"تمھیں تو واقعی بخار ہے — رات کیوں نہ بتایا" ———

میرے چہرے پر ایک ٹھنڈی ہُوئی مسکراہٹ آ گئی۔

کسی کو کیا خبر ——— کہ یہ بخار نہیں، بلکہ بُجھی ہوئی اُمیدوں کا ———

دُھواں ہے۔ جو خون میں حرارت بن کر پھنک رہا ہے!

○

۱۵- دسمبر ۱۹۵۵ء

کتنے ہی بے کیف دن بیت گئے ــــ اور کتنی ہی ویران راتیں مجھے زندگی کے تلخ حقائق سے باخبر کرتی ہوئی گزر گئیں۔

لوگ وہ نہیں ہوتے ــــ

جو ہم اُنھیں سمجھتے ہیں ــــ

یہ احساس کس قدر دِل شکن تھا!

اُس روز کے بعد مجھے ــــ احمر سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا ــــ بس کبھی کبھار شیشے کی دیواروں میں ــــ مَیں نے ایک دُھندلی سی پرچھائیں دیکھی ــــ یا ــــ کبھی سیڑھیاں اُترتے اور چڑھتے وقت ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو جاتے ہیں ــــ

ایسے وقت میں وہ نگاہیں جھکا کر اور سر کو ایک ہلکا سا خم دے کر آگے بڑھ جاتے ــــ

اور مَیں صرف اِتنا ہی پُوچھ کر رہ جاتی ــــ

"آپ خیریت سے تو ہیں نا ؟"

جب وُہ ــــ اثبات میں سر ہلا کر آگے بڑھ جاتے، تو اپنی

ناکامی کا تکلیف دہ احساس پوری طرح مجھے اپنی گرفت میں لے لیتا۔

اور میں اپنی پریشان خیالی سے تھک جاتی ——

نڈھال ہو جاتی ——

اِس سوہانِ رُوح تکلیف —— اور رُوح فرسا احساسات سے مفر تھی —— نہ نجات —— ایک ازلی التہاب —— ایک ابدی اضطراب —— میرا مقدر بن چکا تھا —— میری آنکھیں یُوں اداس رہنے لگی تھیں —— جیسے پت جھڑ کا موسم ——

ایک نامعلوم سا مغموم گھراؤ —— میرے دل کو کچھ اس طرح ٹھنڈے اور گہرے بادلوں سے ڈھکے ہوئے تھا۔ جس میں سے چھن کر سورج کی کوئی سنہری خوشگوار کرن آتی معلوم نہ ہوتی تھی!

مَیں سوچتی ——

کتنا اچھا ہوتا، اگر وہ مجھے ملے ہی نہ ہوتے، اور اگر مل ہی گئے تھے —— تو یُوں چُپکے سے میرے دل میں نہ سمائے ہوتے —— کبھی انھیں دیکھ کر مجھے کتنی آسُودگی میسّر آتی تھی ——

لیکن آج ——

اُن کے صرف ایک دفعہ کے نظر انداز کرنے سے —— میرے دل و دماغ میں کیسے نوکیلے کانٹے پیوست ہو کر رہ گئے۔ جن کی چُبھن مجھے چَین نہیں لینے دیتی —— چند دنوں کی جدائی میں میرا یہ حال ہے —— تو اگر کبھی یہ زندگی کے دوراہے پر مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

بچھڑ گئے —— تب میری حالت یقیناً اس پگڈنڈی کی طرح ہو جائے گی جو کسی خطرناک موڑ پر پہنچ کر اچانک رُک جائے۔

آج جب میں فارغ ہو کر باہر نکلی —— تو گیٹ کے قریب ہی مجھے فراز کی موٹر نظر آئی —— مجھے دیکھ کر فراز موٹر سے باہر نکلا، اور قریب آ کر بولا:

"مس بینا —— احمر آپ کا انتظار کر رہے ہیں —— کیا آپ ملنا پسند کریں گی؟"

چند لمحوں کے لیے میری قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔

یہ احمر کس قدر عجیب ہیں —— جب اُن سے ملنے کے لیے، کوئی خاک چھانتا پھرتا ہے، تو یہ نہیں ملتے —— اور جب تمام اُمیدیں تھک کر سو جاتی ہیں —— تو یہ اچانک آ کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں!

"وہ کہاں ہیں ——؟"

گھٹے گھٹے لہجے میں میں نے پُوچھا۔

"اگلے موڑ پر!" فراز نے کہا —— اور موٹر کا پچھلا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔

میں اندر بیٹھ گئی۔

مجھے میری محبت نے بے اختیار کر دیا —— میں بھول گئی —— اپنی ناکامی کو —— اُن دُکھوں کو جو پچھلے کئی دن تک میں جھیلتی

رہی تھی ——— مَیں نہیں جانتی ——— یہ کون سی کشش تھی ——— جو مجھے سب کچھ بھلا دینے پر مجبور کر دیتی تھی ——— میری حالت مسمریزم کے اُس مریض کی سی ہو جاتی تھی ——— جسے اپنے خیالات پر کوئی اختیار نہ رہتا ہو ———

فراز نے گاڑی اسٹارٹ کی ——— اور موٹر سیاہ تارکول کی ہموار سڑک پر پھسلنے لگی۔

موسم بے حد سرد تھا ———

آج آسمان کا کچھ عجیب ہی رنگ تھا ——— گہرا زرد ——— یُوں جیسے دُنیا کے سارے انسانوں کے دلوں کی نفرت آسمان پر چھا گئی ہو ——— مَیں نے اپنی زندگی میں کبھی آسمان کا رنگ یُوں نہ دیکھا تھا ——— دہشت انگیز حد تک زرد ——— مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔

موڑ پر گاڑی رُکی ———

اور شہتوت کے گھنے درخت کی اوٹ سے احمر نکلے!

دروازہ کھولا ———

اور ——— مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے ——— ٹھنڈ کی وجہ سے انھوں نے چسٹر پہن رکھا تھا ——— اور بال کچھ نم سے ہو کر ماتھے پر ڈھلک آئے تھے ———

خواب جیسے پھر سے جاگ اُٹھے ———

اُن خوبصورت آنکھوں کی تپش مجھے پگھلانے لگی —— میرا ذہن، سادہ ورق کی طرح ہو گیا —— جس پر سے تمام اُلجھے ہوئے نقش و نگار مٹ گئے ہوں۔

فراز نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی —— ہمارے درمیان خاموشی کی دیوار حائل دیکھ کر وہ مسکرایا۔

کہنے لگا:

"کیا تعارف کی رسم مجھے ادا کرنی ہو گی؟"

"نہیں —— نہیں —— اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" احمر بولے۔

اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی ——

فراز گاڑی ڈرائیو کرتا رہا —— اور میں بے معنی نظروں سے باہر کی بھاگتی ہوئی چیزوں کو دیکھتی رہی —— ہم شہر کی حدود سے باہر آ گئے تھے —— اور موٹر کا رُخ اُسی جانب تھا —— جہاں ہم پہلے بھی کئی بار آ چکے تھے —— باہر ہوا کسی ضدی بچے کی مانند مچلی ہوئی تھی۔

اچانک برسات شروع ہو گئی ——

موسلا دھار پانی —— بنجر زمین کی پیاس بجھنے لگا —— آسمان سے نفرت کا غبار دُھل کر زمین کی گہرائیوں میں دفن ہو گیا —— ہم گاڑی میں بیٹھے اِن تمام تبدیلیوں کو دیکھتے رہے ——

فراز نے انجن بند کر دیا ——

اور ہماری طرف رُخ کر کے بیٹھ گیا۔

کہنے لگا :

" احمر، بنیا —— آپ سے بہت ناراض ہیں"۔

" نہیں نہیں —— ناراضگی کی کیا بات ہے؟ —— ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے !" مَیں نے کہا۔

" آپ غلط سمجھ رہی ہیں —— دراصل بات یہ تھی کہ" —— اُنہیں موزوں الفاظ نہ مل رہے تھے !

مَیں جلدی سے بول اُٹھی :

" مَیں آپ سے قطعاً نہیں پوچھ رہی —— آپ جواز نہ ڈھونڈیے اور پھر میرا آپ پر حق بھی کیا ہے —— جو پوچھوں —— مجھے اپنی ذات پر اختیار نہیں —— اگر ہوتا —— تو آج پھر —— مَیں یہاں نہ ہوتی —— اور جب مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں —— تو —— آپ پر اختیار کیسے ہو سکتا ہے؟ —— آپ نے وُہی کیا، جو مناسب سمجھا" ——

" مَیں آپ سے شرمندہ ہوں —— پتہ نہیں —— مَیں کہاں چلا گیا تھا اور —— اب مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں —— کہ پھر کبھی ایسا موقع نہ آئے گا !"

اُن کی قربت سے میرے غم کی شدت تو کم ہو ہی چلی تھی —— اب یہ الفاظ میرے درد کا مداوا بن گئے —— میرا دل ایک عجیب و غریب

زنی سے لبریز ہو گیا ــــ ان کی ہر بات پر بھروسہ کر لینا تو میرے مزاج کا ایک حصّہ ہی بن چکا تھا!

بارش اب تھم چکی تھی ــــ

آسمان کا تمام غبار معدوم ہو چکا تھا ــــ اور دُھلے ہُوئے شفّاف آسمان پر باریک آنچل کی طرح کے سفید بادل کے اوٹ سے آدھا چاند جھانک رہا تھا ــــ اور میرے دل کا غبار بھی دُھل چکا تھا ــــ اور اُن کی آنکھوں کی نرمی، ان کے ہونٹوں کی مُسکراہٹ میرے دل میں روشنی بکھیر رہی تھی!

فراز نے اپنا چسٹر سنبھالا ــــ اور باہر نکل گیا ــــ

انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اُن کے مضبوط ہاتھوں میں میرا ہاتھ یُوں کانپا، جیسے پرندہ اَن جانے گھونسلے میں آشیانے کے تنکے ٹٹولے اور گھونسلے کو آرام دہ پاکر اپنے پَر ڈھیلے چھوڑ کر بیٹھ جائے! اُس محبوب جسم کی قربت مجھے پھر حاصل ہو گئی تھی۔ مَیں نے اُن کے کشادہ سینے پر سر رکھ دیا، اور مدھم مدھم لہجے میں کہنے لگی:

چاہنے والی عورت کا پیار ــــ بڑا گہرا ہوتا ہے ــــ پاتال سے بھی زیادہ گہرا ــــ اور اُس کے دل کا آبگینہ ــــ حباب سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے ــــ میرے دل کو کبھی ٹھیس نہ پہنچانا ــــ ورنہ مَیں جی نہ سکوں گی ــــ

انھوں نے مجھے اپنی باہوں میں بھینچ لیا ــــ اور میرے

سیاہ بالوں پر — اپنے ہونٹ رکھ دیئے —

اور مجھے ایسا لگا —

جیسے میری روح کے گھاؤ پر کسی نے — پیار کا پھایہ رکھ دیا ہو —

اوہ — یہ کہکشاں کے راستے —

دو گلابی ہونٹ —

اور دو مضبوط بازوؤں کا پیارا حصار —

○

۳۰- دسمبر ۱۹۵۵ء

کل ہمارے اسٹاف میں ایک نئی لڑکی کا اضافہ ہُوا ہے ،!

اور وُہ ہے شگفتہ !

مسکراتے چہرے ، لانبے قد ——— اور کٹے ہوُئے سُنہرے بالوں والی لڑکی ، اپنے نام کی طرح مزاج کی بھی شگفتہ ہے. کل وُہ چند گھنٹے میرے ساتھ رہی ——— اور اتنے تھوڑے عرصے میں وُہ مجھ سے یوُں گھُل مِل گئی ——— جیسے ہم برسوں سے ملتے رہے ہوں ——— باتیں بہت پُر لطف کرتی ہے ——— مَیں بھی آج کل اپنی تنہائی سے عاجز آئی ہوئی تھی ——— اور وقت گزارنے کے لیے ——— شگفتہ کا ساتھ کچھ بُرا نہیں !

آج کل میرا زیادہ وقت ناول پڑھنے میں گزرتا ہے ——— لیکن بعض اوقات اِن سے بھی بور ہو جاتی ہوں ———

میرے ساتھ کی تمام لڑکیاں جا چکی ہیں !

کچھ کی شادیاں ہو چکی ہیں ———

اور کچھ آگے تعلیم حاصل کرنے جا چکی ہیں ———

راحیلہ کے خط اکثر آتے رہتے ہیں۔ اُس نے میڈیکل لائن جوائن کرلی ہے، اور اپنے روشن مستقبل کے لیے جدو جہد کر رہی ہے۔

سیمیں نے کسی میجر سے شادی کرلی ہے —— اور وُہ اپنی زندگی سے بے حد مطمئن ہے۔

راحیلہ کے خطوط میں —— سیمیں کا ذکر اکثر ہوتا ہے —— اور اس کے بعد یہ اصرار ہوتا ہے!

تو —— بیٹا ——!

اب تم بھی شادی کر ہی ڈالو —— کسی اچھے سے انسان کو اپنا جیون ساتھی بنا لو —— زندگی کا دامن بہت وسیع ہے —— تم کوشش کر کے دیکھو، —— خوشیاں تمھاری منتظر ہیں —— اُن سے اپنی آغوش بھر لو —— یوں پہاڑ سی زندگی ساتھی کے بغیر کیسے گزارو گی کسی کو اپنی مسرتوں —— اور دُکھوں —— میں شریک کرلو۔ کسی کو اپنی تنہائیوں کا ساتھی چُن لو —— اب دیکھو نا —— سیمیں اپنی زندگی سے کتنی مطمئن ہے —— ایک دن بھی اپنے شوہر کے بغیر نہیں رہ سکتی —— جب بھی ملنے آتی ہے، تو ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرتی ——

کہتی ہے:

قیصر کے آنے کا وقت ہو رہا ہے —— مجھے گھر میں نہ دیکھیں گے —— تو کھانا تک نہ کھائیں گے —— سارا دن مُوڈ

آف رہے گا، اور مجھ سے —— اُن کی ناراضگی برداشت نہیں ہوتی ——

دیکھا تم نے ——

کبھی یہی سیمیں سارا سارا دن ہم سے باتیں کرتے نہ اُکتاتی تھی۔ اور اب چند گھنٹے اُن کے بغیر نہیں رہ سکتی —— میں بھی اُسے مسرور دیکھ کر خوش ہُوں —— زیادہ نہیں روکتی ——

تم بھی اپنا شریکِ حیات منتخب کر لو —— پھر تم سب کچھ بھول جاؤ گی —— اپنے ماضی کو —— اپنے دُکھوں کو —— حتیٰ کہ مجھے بھی! تم نہیں سمجھ سکو گی بدنیا! مجھے تمھارا کتنا خیال رہتا ہے۔ تمھارے پاپا کی شادی کی خبر میں نے سُن لی تھی —— اور اسی لیے تمھارے لیے بہت فکر مند ہُوں —— یُوں تنہا کب تک —— بھٹکتی رہو گی —— اور ہاں —— وہ تمھارے احمر کیسے ہیں؟ کیا ان کی طرف سے کوئی پیش کش نہیں ہُوئی؟ اگر کبھی ایسا موقع آئے تو انکار نہ کرنا ——

چلو —— کوئی تو ہے، جیسے میرا خیال ہے۔ میں اس احساس سے کتنی آسُودگی محسوس کرتی ہوں —— واقعی —— اچھے دوست زندگی میں بار بار نہیں ملتے۔

لیکن اب میں اُسے کیا بتاؤں —— ہمسفر یُوں آسانی سے نہیں ملا کرتے —— قدم بقدم چلنے کو تو سب ہی تیار ہوتے ہیں —— لیکن آخری

سانس تک ساتھ دینے کا حوصلہ کون رکھتا ہے، اور پھر —— مجھ جیسی بے آسرا لڑکی کا ساتھ —— جو جہیز میں کچھ نہ لا سکے —— جس کا سرپرست کوئی بڑا آفیسر نہ ہو، اور جو خود چند سو روپوں کے لیے نوکری کرتی ہو. اس کا رفیقِ حیات بننے پر کون آمادہ ہوگا —— اور احمر —— اُن کے رویّے سے تو مَیں آج تک کچھ اخذ نہیں کر سکی ہُوں —— پھر بھی مَیں نے سوچا تھا، کہ اُنھیں سمجھنے کے لیے چاہے مجھے کتنا چلنا پڑے —— مَیں نہ تھکوں گی —— مَیں اُن کی رُوح کا سراغ پا لُوں گی —— لیکن اُن کی —— عجیب و غریب شخصیّت کے صحراؤں میں خود بھٹک گئی ہوں —— بھٹکتی پھر رہی ہُوں —— مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا —— میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا —— اگر ان کا ایک دن کا رویّہ مجھے اپنائیت کا یقین دلاتا ہے، تو دوسرے دن وہ یُوں ملتے ہیں —— جیسے کبھی جانتے نہ ہوں —— اگر ایک دِن گرمجوشی سے پیش آتے ہیں، تو دوسرے ہی دن وہ اپنے جلو میں برف کی سی سرد مہری لیے ہوتے ہیں —— وہ مہربان بھی ہیں —— اور بے رحم بھی —— بیک وقت وہ مجھ سے محبت بھی کرتے ہیں اور شاید نفرت بھی —— یہاں مَیں نفرت اس لیے کہہ رہی ہوں —— کہ اگر اُنھیں میرا خیال ہوتا —— تو وہ مجھے یُوں —— دُکھ نہ دیتے —— ان کی شخصیّت پر —— اِتنے گہرے خول چڑھے ہیں، کہ مَیں اُنھیں —— دیکھ نہیں سکتی —— پہچان نہیں سکتی —— قلعے کی دیواریں بہُت اُونچی ہیں —— وہ باہر نہیں

نکل سکتے ــــ اور یُوں وُہ میرے لیے ــــ ایک الجھا ہُوا مسئلہ بن کر رہ گئے ہیں ــــ

راحیلہ کہتی ہے ــــ میں شادی کر لوُں ــــ

مگر ــــ کیسے ؟

احمر نے تو مجھ سے کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا ــــ کبھی کوئی یقین نہیں دلایا ــــ انھوں نے تو شاید اپنے بارے میں کبھی سنجیدگی سے نہ سوچا ہوگا ، وہ میری پریشانیوں کو کیا جانیں ؟

○

یکم جنوری ۱۹۵۶ء

اوپیرا میں بڑی اچھی پکچر لگی ہے۔ لڑکیاں بڑی تعریف کر رہی ہیں میرا جی چاہا —— میں بھی دیکھوں —— سوچا —— احمر کے ساتھ دیکھ لوں گی۔

رات کو زیادہ دیر تک باہر رہنا کچھ مناسب نہیں لگتا —— اس لیے میں ایک بجے احمر سے ملنے اُن کے آفس چلی گئی ——

ان کے کمرے میں حسبِ معمول خوب رونق تھی —— آج مس نُور بھی وہاں جلوہ افروز تھیں —— مس نُور یہاں اناؤنسر کی پوسٹ پر کافی عرصہ سے کام کر رہی ہیں۔ لیکن مجھے اُن کے ساتھ کچھ زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا —— جن اوقات میں میری ڈیوٹی ہوتی ہے —— وُہ فارغ ہوتی ہیں۔ اس لیے شاذو نادر ہی ملنا ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ اپنے آپ کو بہت لیے دیے رہتی ہیں —— اس لیے میں اُن سے کچھ زیادہ بے تکلّف نہیں۔

مجھے دیکھ کر پوچھنے لگی:

"کیسے آنا ہُوا بینا؟"

"احمر کے پاس میری کچھ کتابیں تھیں ——— وہ لینے کے لیے آئی تھی۔"

احمر جان گئے، ——— کہ مَیں بہانہ بنا رہی ہوں۔

وہ خفیف سا مسکرائے، بولے :

"تشریف رکھیے!"

مَیں بیٹھ گئی ——— تو انھوں نے چپراسی کو چائے لانے کے لیے کہا —— اور اپنے دوستوں سے ——— گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

نہ جانے ——— انھیں ہر وقت کچھ لوگوں کو اپنے پاس جمع رکھنے کا کیا خبط ہے ——— جب بھی آؤ —— تین چار دوست موجود ہوں گے ——— کبھی کچھ کہنا ہو —— تو دل مسوس کر رہ جاتی ہوں —— شاید دوستوں کو یُوں جمع کر کے اور اپنی باتیں منوا کر اُن کی انا کو تسکین ملتی ہے ——— خود پسندی کی انتہا ہے یہ تو —— مَیں نے دل میں سوچا۔

چائے آئی —— مس نور نے چائے بنا کر سب کو پیش کی ——— اس دوران میں بھی زیادہ تر احمر بولتے رہے۔

آفس کا وقت ختم ہُوا ——— اُن کے دوست ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، آخر میں مس نور جانے کے لیے کھڑی ہوئیں پُوچھنے لگیں :

"تم نہ چلو گی بینا؟"

"نہیں —— مَیں ابھی کچھ دیر بیٹھوں گی!" —— مَیں نے نظریں جُھکا کر کہا۔

وُہ مجھے عجیب نظروں سے گھورتی ہُوئی چلی گئیں۔ اِس وقت کمرے میں احمر تنہا رہ گئے تھے۔

مَیں نے کہا:

"اوپیرا میں بڑی اچھی پکچر لگی ہے —— چلیے —— میٹنی شو دیکھ لیتے ہیں۔"

"اِس وقت ——" حیران ہو کر بولے۔

"کیوں —— کیا ہُوا —— ؟"

"کچھ نہیں —— ابھی تو دو گھنٹے بِتایا ہیں۔"

"آپ کی معیّت میں وقت گزرنے کا احساس ہی کب رہتا ہے۔" دبے لہجے میں، مَیں بولی۔

"اچھا سوچتے ہیں —— مجھے ذرا یہ فائلیں دینی ہیں —— ابھی حاضر ہُوا ——" انھوں نے کہا —— اور باہر نکل گئے۔

میز پر رضیہ بٹ کا ناول "صاعقہ" پڑا تھا۔ مَیں نے اٹھایا اور ورق گردانی کرنے لگی —— وقت دبے پاؤں گزرتا گیا۔

مَیں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی —— ۲ بج رہے تھے —— مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔

احمر خدا جانے کہاں چلے گئے تھے ؟

بظاہر میری نگاہیں کتاب پر جمی تھیں۔ لیکن میں کچھ نہ پڑھ سکتی تھی۔

پھر ڈھائی بجے — پھر تین — احمر کو کمرے سے گئے ۲ گھنٹے — ہو گئے تھے۔ لیکچر کا ٹائم بھی گزر چکا تھا — لیکن ان کا کہیں پتہ نہ تھا — میرا غصّہ انتہا پر پہنچ گیا — اچانک کمرے کا دروازہ کھلا — وہ اندر داخل ہوئے — اور پھر ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے — یوں جیسے اُنھیں توقع نہ تھی، کہ میں اب تک اُن کے انتظار میں بیٹھی رہوں گی — پھر وہ آگے بڑھے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

میری نگاہیں کتاب پر جمی ہوئی تھیں، اور چہرہ تمتما رہا تھا — ذہن کھول رہا تھا — اور میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی — میں نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی — اور اُٹھ کھڑی ہوئی —

"میں جا رہی ہوں" —

وہ خاموش رہے — اور اُن کی یہ خاموشی جلتی پر تیل کا کام کر گئی — میں نے نگاہیں اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا — وہ پنسل ہاتھ میں لیے کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے — انھیں ذرا احساس نہ تھا کہ میں دو گھنٹے سے — اُن کا انتظار کر رہی ہوں — آخر — یہ چاہتے کیا ہیں؟

میں اُن کے لیے ایک رنگین کھلونے سے زیادہ اہمیّت نہ رکھتی تھی — جب تک ان کا دل چاہتا تھا — وہ کھیلتے تھے،

اور جب وہ اُکتا جاتے تھے، تو پھینک کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ غصّے سے میرا دماغ پھُنک رہا تھا۔

"جو آپ کیا کرتے ہیں ـــــ وہ ٹھیک نہیں ـــــ یا، جو مَیں سمجھتی ہُوں، وہ غلط ہے" ـــــ مَیں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہے۔

"آپ ـــــ آپ میری زندگی سے کیوں کھیل رہے ہیں احمر!" رُندھی آواز سے مَیں نے پھر کہا۔

اور کمرے سے باہر نکل آئی ـــــ

○

وہ ایسا کیوں کرتے ہیں ـــــ کیوں کرتے ہیں ـــــ میرے ذہن میں یہی ایک سوال گردش کر رہا تھا ـــــ غصّے کی شدّت سے میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا ـــــ اور میرے پاس اپنے سوال کا کوئی جواب موجود نہ تھا ـــــ

مَیں نے رکشہ لیا ـــــ ہوسٹل پہنچی ـــــ اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے، لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر لیٹ گئی ـــــ اس وقت مجھے یُوں لگ رہا تھا ـــــ جیسے میرے دماغ کی نسیں

پھٹ جائیں گی۔ ہر چیز پھنک رہی تھی ـــــ جل رہی تھی ـــــ اور۔ اس آگ کو بجھانا میرے اختیار میں نہ تھا۔ ایک چھوٹے انسان کے اندر بھی آگ کا وہ شرارہ موجود ہوتا ہے۔ جو موقع پانے پر شعلہ جوالہ بن کر چاروں طرف پھیل سکتا ہے ـــــ اور اس وقت میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہوا تھا۔

یہ خیال کہ:

احمر مجھ سے کھیل رہے ہیں ـــــ

میرے فردوسِ حیات کو تاراج کر کے شعلے کی مانند میرے ـــــ ہوش و خرد کو چاٹنے لگا تھا ـــــ میرے سارے منصوبے جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ میں اپنے آپ کو اس ٹوٹی کشتی سے مشابہ سمجھنے لگی تھی جس کے شکستہ ٹکڑوں کو طوفانِ حوادث نے اٹھا کر ساحل سے دُور بہت دُور پھینک دیا ہو۔

کیسے عجیب لوگ ہوتے ہیں، جو آندھی کی طرح ایک معصوم دوشیزہ کی زندگی میں آتے ہیں، اور بگولے کی طرح اپنے ساتھ اُسے بھی اڑائے لیے پھرتے ہیں، اور آخر میں بغیر کسی سبب کے جہاں جی چاہتا ہے۔ اُسے پھینک کر آگے بڑھ جاتے ہیں ـــــ اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔

یہ جانے بغیر ـــــ کہ ان کے جانے کے بعد اُس بے گناہ لڑکی پر کیا گزری ـــــ پیار کی محرومی اُس کے لیے کتنی حشر خیز ہو گی ـــــ

اور یادوں کی کسک کتنی جان لیوا۔ اِس پر دُنیا والوں کی انگشت نمائی، گھر والوں کا نفرت انگیز رویّہ اُسے زندگی سے بیزار کر دیتا ہوگا اور تب وہ اس ناقابلِ برداشت اذیّت سے گھبرا کر —— موت کی دُعائیں مانگتی ہوگی۔

لیکن دوسروں کی زندگی سے کھیلنے والوں کو اس سے کیا غرض، وہ مسرّتوں سے بھرپُور لمحوں کے ساتھی ہوتے ہیں —— غم کے دور کے ہمراہی نہیں —— وہ صرف پانی پر تیرتے ہوئے کنول کو دیکھنا چاہتے ہیں —— اس انجام کو نہیں جہاں پر کنول کی —— پتّی پتّی مرجھا جاتی ہے۔

بالکل پاگل ہوتی ہیں ہم لڑکیاں بھی —— سارے رنگین سپنے —— ساری آرزوئیں —— ساری تمنائیں، ایک اجنبی کی ذات سے وابستہ کر لیتی ہیں، یہ سوچے بغیر —— کہ وُہ اِس کا اہل ہے بھی یا نہیں۔

اور یہ کون جانتا ہے، کہ سپنے جب ٹُوٹ جاتے ہیں —— خیال جب بکھر جاتے ہیں، تو دوبارہ ترتیب نہیں پا سکتے۔ جلد بازی میں ہم کتنے غلط فیصلے کر لیتے ہیں۔ جن کا خمیازہ آگ کی صُورت میں دلوں کو نِگلنا پڑتا ہے —— دلوں کے انتخاب اور شخصیتوں کی جنگ میں جب ہمارے آئیڈیل ٹوٹ جاتے ہیں —— تو جانے اس کی سزا رُوحوں کو کیوں مِلتی ہے؟

آئیڈیلز ـــــ جو ہم سب کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہیں۔
جو ہم انتہائی کاوشوں اور خونِ دل سے زندگی کے بڑے ہی ـــــ خواب ناک لمحوں میں اپنے خوابوں کے آسمان پہ تخلیق کرتے ہیں، اور جو پل بھر میں دوپہر کی ننگی، زرد اور بے مروّت دھوپ میں زمین پر آگرتے ہیں ـــــ جیسے کوئی عظیم عمارت ـــــ ہزاروں برس کی تعمیری کاوشوں کے بعد، ـــــ پل بھر میں ایک شدید زلزلے کے جھٹکے سے زمین بوس ہو جائے۔

اور جب ہمارے آئیڈیلز ـــــ ہمارے اندر کی شکستوں کے لرزہ خیز جھٹکوں سے ٹوٹتے ہیں، تو اپنے ساتھ ہماری شخصیت کے سارے تناؤ ـــــ اور سارے عزائم بھی لہولہان کر جاتے ہیں، اور شیشے کی یہ کرچیاں آج میری رُوح میں بھی پیوست ہو گئی ہیں ـــــ انھیں چُنا نہیں جا سکتا ـــــ پھر بھی بارہا ـــــ اِنھیں چُننے کے لیے بے اختیار میں نے اُسی محبّت کو آواز دی ہے احمر ـــــ جس نے یہ ٹکڑے میری رُوح میں پیوست کر دیے ہیں ـــــ میرا ہر جذبہ ـــــ ہر آرزو ـــــ آج گھائل ہے ـــــ

ہم اُنھیں سے محبت کیوں کرتے ہیں احمر ـــــ جو ہمیں دُکھ دیتے ہیں ـــــ سُنا ہے، دُکھ دینے والی شے سے گریز کیا جاتا ہے ـــــ لیکن میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی ـــــ مارفیا، اور پیتھیڈین کے انجکشن کے عادی کی طرح ـــــ جو یہ جانتا ہو، کہ یہ زہر

جو اس کی رگ رگ میں گھل رہا ہے، اُسے موت کی برفیلی وادیوں میں لے جائے گا ——— لیکن پھر بھی ——— جب خواہش اور طلب سے اُس کا انگ انگ ٹوٹ رہا ہو ——— وہ اُسی انجکشن کے لیے تڑپتا ہے، ——— مچلتا ہے ——— اور انجکشن لینے کے بعد ——— یُوں سکون پذیر ہو جاتا ہے، جیسے اِس سے بڑی سرور انگیز، اور کیف پرور شے دنیا میں نہ ہو۔

بالکل اسی طرح جب وہ میرے قریب ہوتے ہیں، تو ویرانی میں پھنسے ہونے اور دلدل میں دھنسے ہونے کا یہ جان لیوا احساس اُن کی عنایت اور لمحاتی پیار مٹا دیتا ہے، ——— اُن کی محبت کے یہی چند دمکتے ہوئے لمحے تو ہیں، جن کے لیے میں اپنے جذبات کو سُولی پر لٹکائے رکھنے پر آمادہ ہُوں ——— لیکن میں اِس سے خُوب واقف ہُوں، کہ میں اپنا سب کچھ لٹا کر بھی ناکام ہُوں ——— اور وہ سب کچھ بچا کر بھی کامران ——— میں اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی خالی ہاتھ ہُوں، میرے لیے بادلوں میں بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں ——— وہ فاتح ہیں ——— وہ مجھے محبت میں زہر کو امرت بنا کر دیتے ہیں ——— اور میں اُسے امرت سے بھی سوا سمجھ کر پی جاتی ہُوں ———

کبھی کبھی سوچتی ہُوں ——— کہ میں نے اپنا سفر کہاں سے شروع کیا تھا ——— اور کہاں نکل آئی ہُوں؟

میرا دل چاہتا ہے، کہ میں پکار پکار کر اُن سے کہوں ——
کہ میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا —— میں نے تم سے جو محبت کی،
تم نے اس کی قدر نہ کی —— لیکن میں نے جیسے تمہیں چاہا ہے ——
ایسے پھر کوئی تمھیں نہ چاہے گا —— زندگی میں کوئی لڑکی تمھیں
اتنی شدّت سے پیار نہ کر سکے گی، —— کبھی نہیں کر سکے گی ——
اور مجھے یقین ہے، —— کہ ایک نہ ایک دن تمھیں خود اس کا
احساس ہو جائے گا، لیکن ممکن ہے —— اُس وقت تک کچھ باقی
نہ رہے —— تب تم مجھے ڈھونڈو گے —— اور —— کہیں
نہ پاؤ گے، —— تم پچھتاؤ گے —— لیکن گزرا وقت لوٹ کر
نہ آئے گا —— کہ جو موقع —— جو وقت ہم گنوا دیتے ہیں،
وہ پھر کبھی ہمارے ہاتھ نہیں آتا ——

تم کیوں نہیں سمجھتے —— تم جو اِتنے سمجھ دار —— زمانہ شناس
اور تعلیم یافتہ ہو —— کہ دل جب ٹوٹ جائے —— تو یہ کرچیاں
پھر جُڑ نہیں پاتیں —— اور پھر عورت کے دل کا آبگینہ ——
تو حباب سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے —— اگر یہ آبگینہ ایک
بار ٹوٹ جائے —— تو دُنیا کی کوئی طاقت اِسے نہیں جوڑ سکتی۔
میرے دل کو ٹھیس نہ پہنچانا احمر —— اگر ایسا ہو گیا —— تو
میں اُن تاریک کھائیوں میں کود جاؤں گی —— جہاں سے پلٹ
کر کبھی کوئی نہیں آیا ——

لیکن ——— مَیں اُن سے کچھ نہیں کہہ پاتی ——— کہ میری تمام صلاحیتوں پر وُہ چھائے ہوئے ہیں ———

اور پھر ———

ابھی تو مَیں ——— پُوری طرح اُن سے مایوس بھی نہیں ہُوئی۔ کبھی کبھی ان کا التفات اِتنا بڑھ جاتا ہے، کہ اُمیدوں کے بھڑکتے بُجھتے چراغ پھر سے جل اُٹھتے ہیں۔

○

۲۵- جنوری ۱۹۵۶ء

دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل کس قدر اذیت ناک ہے۔ لیکن اس کے باوجود —— میں احمر سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتی —— اُن کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے —— میری شخصیت اُدھوری ہے —— ان کے بغیر مجھے یوُں لگتا ہے۔ جیسے راہ حیات میں —— ایک قدم بھی نہ چل سکوں گی —— میں ان کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہُوں۔ —— میں چاہتی ہوں —— اِس عظیم محبت کا سایہ —— سدا میرے ذہن پر سایہ کناں رہے —— جتنی شدّت سے میں نے انھیں چاہا ہے —— پیار کیا ہے —— اس شدّت کے ساتھ —— میں پھر کبھی —— کسی کو نہ چاہ سکوں گی۔ میں ہر لمحے —— ہر پَل اُن کے متعلق سوچتی رہتی ہوں، —— جان بوجھ کر یاد نہیں کرتی —— بلکہ میرے ذہن کی تمام صلاحیتوں پر وُہ —— اور صرف وُہ، چھائے ہوئے ہیں —— ان کے خیال کے علاوہ —— کوئی دُوسرا خیال میرے ذہن میں جاگزیں نہیں ہو سکتا —— جب وہ میری نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں —— تو میری ساری ہمتیں جواب دیے جاتی ہیں ——

میرے سارے عزائم تھک کر سو جاتے ہیں —— اور مَیں اپنے آپ کو شاخ سے ٹوٹے ہوئے زرد اور سُوکھے پتّے کی طرح محسوس کرتی ہُوں، —— جو خزاں رسیدہ ہواؤں کے تند جھونکوں کے ساتھ یہاں سے وہاں بھٹکتا پھرتا ہے —— اور جب وہ میرے قریب ہوتے ہیں —— تو مجھے یُوں لگتا ہے —— جیسے دُنیا میرے قدموں میں ہے —— جیسے —— بہار کے پھُولوں سے میرا دامن بھرا پڑا ہے، اور آنسوؤں کی شبنم تلے سے مسکراہٹ یُوں اُبھرتی ہے جیسے بھری برسات کے بعد قوس و قزح شوخی سے جھلملا اُٹھی ہو —— اور میرا دل ایک کیف پرور —— آسُودہ خاطری من ترنگ —— اور گنگناتی ہوئی متلاطم لہر سے سرشار ہو جاتا ہے —— اور مَیں بے خود سی ان کی باتوں کی شیریں نغمگی میں کھوئی رہتی ہوں —— مَیں پیار کے اس اُبلتے چشمے سے اپنی ازلی، ابدی —— تشنگی مٹا لینا چاہتی ہُوں۔ یہ شعلہ بداماں لمحات میری زندگی کے اہم ترین لمحات ہوتے ہیں —— میرے بالوں پر اُن کے پیار کے پھُول ہلکے ہلکے گرتے رہتے ہیں۔ اور مَیں امر بیل کی طرح اُن سے یُوں لپٹتی ہُوں جیسے کبھی جدا نہ ہوں گی۔

میری سیاہ لانبی پلکیں —— اُن کی سحر انگیز آنکھوں پر یُوں جھکی ہوتی ہیں۔ جیسے کسی چشمے پر بید مجنوں کی شاخیں کانپ رہی ہوں —— میرے ہونٹ انار کی کلی کی مانند لرزتے ہیں —— مَیں اُن سے پوچھنا چاہتی ہُوں، کہ جب تم میرے بغیر رہ سکتے ہو —— تو پھر مَیں کیوں نہیں رہ سکتی —— یہ کیسی محبت ہے

جس نے مجھے پاگل بنا رکھا ہے ــــ اور تمہارے اندر برف کی قاش رکھ دی ہے ــــ لیکن میں یہ پوچھ کر اِن خوشگوار لمحوں کو کھونا نہیں چاہتی اسی لیے کچھ نہیں کہتی ــــ

دُنیا میں بہت سے انسان ایسے ہیں۔ جنھیں اپنی عمر میں بہت تھوڑی محبت ملتی ہے ــــ یہاں تک کہ بہتوں کو پیار بھرا ایک بول تک نصیب نہیں ہوتا۔ اگر ایسے انسان کو محبت کا کچھ حصّہ مل جائے۔ تو وُہ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے ــ وہ اس کے لیے اپنی جان تک دے دیتا ہے انھیں اب کون یہ سمجھائے ....

یکم فروری ۱۹۵۶ء

بہت دن گزر گئے ہیں —— احمر کو دیکھے بنا — اُن سے ملے بنا۔ ایک دو مرتبہ میں اسٹیشن بھی گئی — لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ یوں لگتا ہے، جیسے وہ جان بوجھ کر مجھ سے ملنے سے کترا رہے ہیں — یا پھر شاید یہ وجہ ہو — کہ جن اوقات میں میری ڈیوٹی ہوتی ہے —— وہ فارغ ہوتے ہیں — لیکن پہلے تو وہ ان دنوں میں ضرور وہاں آیا کرتے تھے۔ جب مجھے وہاں جانا ہوتا تھا — شاید ناراض ہیں —— کتنی عجیب سی بات ہے — کہ کرتے بھی سب کچھ وہی ہیں — یہ جفائیں —— یہ نامہربانیاں — اور پھر اُن کی خواہش ہوتی ہے، کہ اُنہی کو منایا جائے۔ کہیں بھی تو وہ جھکنا پسند نہیں کرتے — اپنی خودی —— اپنی انا کا اتنا خیال ہے — اپنی خواہش کا اظہار بھی کھُل کر نہیں کرتے — کہ مبادا کسی کے انکار سے اُن کا وقار مجروح نہ ہو جائے۔

میں سوچتی ہوں — کہ وہ اپنی ذات کے لیے جو اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھتے ہیں۔ کیا وہ نہیں سمجھ سکتے، کہ ان کے رویّے سے میرے جذبات مجروح ہو سکتے ہیں — میری انا کو بھی ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔

ممکن ہے ——سب جانتے ہوں —— سمجھتے ہوں —— اور نظر انداز کر جاتے ہوں کہ اپنی ذات سے زیادہ وہ کسی کو اہمیت نہیں دیتے —— اپنی ذات سے زیادہ پیار وہ کسی شے سے نہیں کرتے ——

اور میرا خیال ہے —— کہ وہ محبت جس میں وضع داری قائم رکھی جائے محبت نہیں ہوتی —— وہ شخص جو وضع داری کو قائم رکھتا ہے —محبت نہیں کر رہا ہوتا —— بلکہ تکلف کر رہا ہوتا ہے ——

اور میں —— محبت ہو یا نفرت —کھُل کر کرتی ہوں —— جسے چاہتی ہوں —— ٹوٹ کر چاہتی ہوں —— اُس کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دینا چاہتی ہُوں —— اور اسی کو محبت کی معراج سمجھتی ہوں —— اُن کی شخصیت کے آگے میں اپنی شخصیت، اپنی ذات کو بُھلا بیٹھتی ہوں —میں ہمیشہ اُن کے سامنے جُھک جاتی ہُوں، اپنا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی شکست تسلیم کر لیتی ہُوں —— اور یہ سوچ کر خوش ہو جاتی ہُوں —— کہ اگر اپنے نہ جُھکنے پر —— اپنی شکست تسلیم نہ کرنے پر دل میں بے حد مسرور ہوں گے —کیا پتہ، انھیں اُس وقت کیسی ذہنی تسکین حاصل ہوتی ہو ——

اس طرح میں اُن کی لاعلمی میں اُن کی تسکین کا سامان مہیا کر دیتی ہوں وہ مسرور ہوتے ہیں —— تو مجھے بھی بے پایاں خوشی ہوتی ہے —— اور کبھی کبھی تو محبت میں اِن چھوٹے چھوٹے جذبوں کی قربانی دینا تو کیا —— اپنی جان لٹا دینا بھی ناکافی ہوتا ہے۔

وقت جذبات کی طغیانی کو غیر محسوس طریقے سے اعتدال پر لے آتا ہے

وقت میں یہ کرشمہ سازی نہ ہوتی تو یہ دنیا محشرستان بنی ہوتی۔ ہر سینہ فگار ہوتا — ہر دل شکستہ — اور انسان ناکامیوں کے گلے سے لپٹ کر روتے روتے عمر گزار دیتا۔ یہ وقت ہی کا کمال ہے، کہ انسان غم — مصیبت — پریشانی کا بڑے سے بڑا وار سہہ کر بھی راہِ زندگی پر گامزن رہتا ہے۔ اور غم کی آغوش سے خوشیوں کے سوتے نکال لیتا ہے۔

اور اس وقت مَیں بھی یہ سوچ رہی ہُوں، کہ وہ بچّوں کی سی ضد اور کشیدگی جس نے ہمیں اتنا عرصہ ایک دوسرے سے دور — اور روکے رکھا — کچھ بھی نہ تھا — بس ایک معمولی سی بات تھی — اگر وہ میرے ساتھ بکھر نہ جا سکے تھے — تو اتنی معمولی سی بات پر یُوں اتنے دِن کھنچے رہنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

۵۔ فروری ۱۹۵۶ء

میں کاریڈور سے گزر رہی تھی، کہ اُن کی ہنسی کی مدھم مدھم آواز میرے کانوں میں آئی —— وہ بڑے مسرور لہجے میں —— اپنے دوستوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے —— غم کا ہلکا سا سایہ میرے ذہن سے گزرا —— یہ کتنے مسرور ہیں —— اس کے باوجود کہ میں ناراض ہوں —— وہ میرے روٹھ جانے کو، ناراض ہو کر چلے جانے کو کوئی اہمیّت نہیں دیتے —— انھیں اس کا یقین ہے —— کہ میں آؤں گی —— ضرور آؤں گی —— وہ جانتے ہیں، کہ میں زیادہ دن اُن سے الگ نہیں رہ سکتی، !

اور میں نے یہ دن کیسے گزارے ہیں —— ؟

یہ کچھ میں ہی جانتی ہوں —— کیسے کیسے نہ میرا دل تڑپا —— اُن کا خیال —— ان کی یاد نے مجھے ایک پل بھی چین سے نہ رہنے دیا —— کسی کام میں جی نہ لگتا تھا —— بس جی چاہتا تھا —— کمرہ بند کر کے —— بستر میں لحاف اوڑھے پڑی رہوں —— ناول بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے تھے —— البتہ احمد فراز کی غزلوں کا

مجموعہ "دردِ آشوب" کو مَیں نے دوبار پڑھا —— اور یہ غزل تو کتنی ہی بار گنگنائی :

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کر جانے کے لیے آ
اب تک دلِ خوش فہم کو ہیں تجھ سے اُمیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

جب بھی یہ اشعار میری زبان پر آئے، دل غم سے بوجھل ہو گیا، اور آنکھوں میں آنسو اُتر آئے —— کیسے کیسے لوگ ہیں —— جو ہمیں غموں کے اندھیروں میں بھٹکتا چھوڑ کر خود زندگی کی جگمگاتی شاہراہوں پر ہنسی خوشی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں —— انھیں ایک پل کو بھی اس کا خیال نہیں آتا —— جو اُن کی یاد میں اپنی زندگی کا —— ایک ایک لمحہ —— اُن کی دی ہوئی اذیّت کو سہنے میں بسر کر رہا ہوتا ہے، —— اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے —— کسی کے حصّے میں صرف غم آتے ہیں —— اور کسی کے حصّے میں مسرّتیں —— اب کسی سے کیا گِلہ کرے کوئی۔

انہی خیالات میں غلطاں مَیں اُن کے کمرے کے قریب —— پہنچ گئی —— باتیں واضح طور پر سنائی دینے لگی تھیں —— اُن کا کوئی دوست پوچھ رہا تھا :

"آگے بتاؤ نا —— پھر کیا ہُوا —— ؟

"پھر یہ ہُوا کہ وہ محترمہ نمبر ۵ پہ آئیں —— اور ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد ناکام واپس چلی گئیں"۔ احمر کی آواز آئی۔

"یار بڑے خوش قسمت ہو، کہ لڑکیاں تمھارے انتظار میں گھنٹہ گھنٹہ کھڑی رہتی ہیں —— اور تم انھیں ہجر و فراق کے تمام رموز کا تجربہ کراتے رہتے ہو۔ تب بھی وہ تم پر مہربان رہتی ہیں۔ آج تو بتا ہی دو —— کون سا منتر آتا ہے تمھیں۔" کاشف پوچھ رہا تھا۔

"بھائی —— اب سب باتیں بتانے کی تو نہیں ہوتیں نا —— اور پھر خدا نے تمھیں جو یہ عقل عنایت کی ہے۔ اس سے بھی تو کچھ کام لو۔"

"مصیبت تو یہی ہے احمر —— کہ خدا نے ہمیں نہ تو تم ایسی پُرکشش شکل ہی دی —— کہ لڑکیاں ایک نظر میں گھائل ہوں —— اور نہ ہی ہمارے ذہن کی رسائی اُن چیزوں تک ہے۔ جن سے لڑکیاں متاثر ہوتی ہیں۔" افسردہ لہجے میں کاشف کہہ رہا تھا۔

"اب یہ اپنے اپنے نصیب —— ویسے مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔" احمر کا قہقہہ گونجا۔

"دیکھو ٹالو نہیں احمر —— آج تو یہ بتا ہی دو، کہ تم انھیں بلا کر پھر ملتے کیوں نہیں —— آخر اس میں کیا مصلحت ہے؟" راحیل بولا۔

"اسی میں تو سب کچھ ہے یار۔ اگر میں ہر بار اُن سے مِلتا رہوں —— تو پھر یہ کشش باقی نہ رہے —— یہ احساس کہ میں اُن سے متاثر نہیں ہُوا —— انھیں ضد پہ آمادہ کر دیتا ہے، —— اور وہ مجھے جیت

لینے کے لیے کوشاں رہتی ہیں — آخر اپنی اہمیت کا احساس تو دلانا چاہیے نا — بس اسی لیے یہ سب کرتا ہوں"۔

"بڑا ظلم کرتے ہو، کیوں خواہ مخواہ دُوسروں کو خراب کرتے ہو۔ اگر تمھیں اپنی اس" محترمہ" سے دل چسپی نہیں — تو یہ ناٹک کیوں رچایا ہے مجھے تو بڑا رحم آرہا ہے اس نادیدہ ہستی پر۔" کاشف نے کہا۔

"چھوڑو بھی یار — یہ باتیں میرے سوچنے کی نہیں — جس دن میں یہ سب سوچنے لگا — وہی دن میری شکست کا ہو گا — اور تم تو جانتے ہی ہو — کہ میں نے شکست کبھی تسلیم نہیں کی۔"

○

"اب اتنا اونچا مت اڑو — ورنہ منہ کے بل زمین پر آگرو گے — ایسی چوٹ لگے گی — کہ زندگی بھر نہ بھول سکو گے جب تمھاری یہ باتیں سنتا ہوں — تو سچ مانو — میرا جی چاہتا ہے، — اب تم سے کبھی نہ ملوں — تم جو اتنے بے رحم ہو — تم جو دوسروں کے دلوں سے کھیلتے ہو — لیکن کیا کروں۔ تم میرے دوست ہو — تمھاری ہر خامی کو نظر انداز کر کے تم سے ملنا پڑتا ہے۔" شاکی لہجے میں راحیل کہہ رہا تھا۔

معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں عورتوں کی حمایت میں بولنے کا بہت شوق ہے۔ جبھی ہمیشہ میری مخالفت کرتے ہو ـــــ اب تم ہی انصاف کرو ـــــ میں کب اُن کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہوں ـــــ کہ وہ مجھ سے ضرور ملنے آئیں ـــــ وہ خود آتی ہیں ـــــ وہ اپنے دل سے مجبور ہیں ـــــ اور میں اپنے آپ سے ـــــ ویسے ـــــ یار یہ بات بڑی حیرانگی کی ہے، کہ جب میں ٹائم دیتا ہوں ـــــ تب میرے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہیں ہوتا ـــــ کہ میں اُن سے ملنے نہ جاؤں گا۔ لیکن جب ـــــ وہ وقت قریب آتا ہے۔ تو نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میں جان بوجھ کر وُہ وقت کہیں اور گزار دیتا ہوں ـــــ اور بعض اوقات تو یہاں تک ـــــ کہ اگر کوئی مصروفیت نہ ہو۔ تو گھر جاکر سو جاتا ہوں۔ میری سمجھ میں خود نہیں آتا ـــــ میں ایسا کیوں کرتا ہوں!" احمر کہہ رہے تھے۔

"سیدھی سی بات ہے ـــــ دوسروں کو اذیت دے کر تمھیں تسکین ملتی ہے ـــــ بڑے اذیّت پسند ہو تم" ـــــ راحیل تلخ لہجے میں بولا ـــــ "میری بات یاد رکھو ـــــ کبھی تم بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہو جاؤ گے، اور وہ بھی تمھاری ہی طرح تم سے کھیلے گی ـــــ پھر حال پوچھوں گا حضور کا ـــــ دل لگی کبھی کبھی دل کی لگی بھی بن جایا کرتی ہے ـــــ مت بھولو اسے"

"چھوڑو یار ـــــ بے کار کی باتیں ـــــ یہ محبت وحبّت سب

بکواس ہے — مجھے تو آج تک کسی سے نہ ہوئی۔"

"نہیں ہوئی نا — جبھی تو یوں رسّی تڑا ئے پھرتے ہو، محبت کی زنجیر پیر میں پڑ گئی — تو ہل بھی نہ سکو گے" کاشف نے کہا۔

"ابھی سے کیا کہہ سکتا ہوں — ویسے — یقین رکھو — مجھے نہیں ہوتی کسی سے محبّت — یہ محبّت کرنا — آہیں بھرنا — راتوں کو جاگنا — ہجر و فراق کی داستانیں سُنانا — سب تم لوگوں کے حصّے میں آگیا ہے — میں تو اس کے بغیر ہی بہت اچھی زندگی گزار رہا ہوں" — وہ ہنسے۔

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں — کہ تم اِن مرحلوں سے نہیں گزرے، اگر گزر چکتے — تو تمھیں احساس ہوتا — کہ کیا کیا گزرتی ہے دل و دماغ پر — روح و جسم کا تڑپنا — وُہ فراق — کتنی عظیم محرومی ہوتی ہے وہ — جب آنکھوں سے نیند رُوٹھ جاتی ہے — اور ذہن کچّے پھوڑے کی مانند دُکھنے لگتا ہے، جب محبُوب سے مِلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ تب زندگی کس قدر ویران اور بے کیف لگنے لگتی ہے۔" راحیل نے کہا۔

"راحیل یار — تم تو اچھے خاصے افسانہ نگار ہو — لکھنے کیوں نہیں لگتے، بڑے کامیاب رہو گے — میں تو صِرف یہ جانتا ہوں — زندگی مختصر ہے، جوانی اُس سے مختصر، اور — حُسن

اُس سے بھی مختصر ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے ـــــ کچھ نہ کچھ کرتے رہو ـــ آگے بڑھتے رہو۔ کسی ایک جگہ بیٹھ جانے سے آدمی شاخ میں لگے ہوئے پتّے کی طرح ایک روز سڑ کر گر جاتا ہے"۔ احمر کہہ رہے تھے۔

"تمھارا یہ فلسفہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، اور تم ان لوگوں میں نہیں ہو جو قائل ہو جاتے ہیں ـــ یا جنھیں قائل کیا جا سکتا ہے"۔

"دیکھا ـــ جیت ہمیشہ میری ہی ہوتی ہے!" وہ مسرور ہو کر بولے۔

"ان سب باتوں سے قطع نظر ـــ تمھاری خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں کبھی کبھی تو رشک آنے لگتا ہے تم پر ـــ ہمیں بھی سکھاؤ ـــ کون سا جادو کرتے ہو تم ـــ کہ لڑکیاں یوں دیوانوں کی طرح تمھارے آگے پیچھے پھرتی ہیں"۔ کاشف ہنسا۔

"اوہو ـــ اگر یہ بتا دیا، تو پھر میرے پاس کیا بچے گا ـــ اور پھر تم سب تو مجھے اتنا لعن طعن کر رہے ہو ـــ پھر تم میں اور مجھ میں فرق ہی کیا رہے گا"۔

اب وہ جادو ہم سب لڑکیوں پر تو آزماتے نہ پھریں گے۔ وہ تو ہم اپنی ہونے والی بیوی کے لیے پوچھ رہے ہیں ـــــ اُسی پر آزمائیں گے"۔ کاشف بولا۔

"بیوی پر آزمانے کی ضرورت نہیں ـــ وہ ویسے ہی تم پر جان چھڑکنے لگے گی ـــ بس دو چار محبت کے ڈائیلاگ روز سُنا دیا کرنا ـــ وُہ بالکل

تمھاری تابعدار رہے گی — کہ عورت کو مائل کرنے کا اس سے زیادہ "زود اثر" نسخہ اور کوئی نہیں۔"

"تم کیوں اپنی ہونے والی بیگم صاحب کے لیے یہ "زود اثر" نسخہ محفوظ نہیں رکھتے — کچھ اُس کے لیے بھی بچا رکھو نا" —

"میری نظر میں بیوی اور محبت دو بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ آپ محبوبہ سے تو محبت کر سکتے ہیں، بیوی سے نہیں۔" احمر نے کہا۔

"کاشف کس بحث میں اُلجھ گئے ہو — یہ حضرت ماننے والوں میں سے نہیں ہیں — اٹھو چلیں"۔ راحیل کی آواز آئی اور اُن کے اُٹھنے کی آہٹ ہوئی تو میں جلدی سے بازو والے شہاب کے کمرے میں گھس گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی — کہ وہ مجھے یہاں دیکھیں — اور یہ جان جائیں، کہ میں اُن کی گفتگو سُن چکی ہوں۔

○

۱۰- فروری ۱۹۵۶ء

نہ جانے یہ میری کیسی عجیب عادت ہے، کہ ایک لمحے میں —— مسرور و شادماں ہو جاتی ہوں، اور دوسرے لمحے میں آزردہ و ملول۔ خوشی کی ذرا سی بات مجھے بہت زیادہ مسرور بنا دیتی ہے —— اور اسی طرح غم کا ایک ہلکا سا جھونکا مجھے —— عمیق گھاٹیوں میں اتارے لے جاتا ہے ——

اُس دن میں بڑے خوشگوار موڈ میں وہاں گئی تھی —— لیکن احمر کی باتیں سُن کر طبیعت بڑی بیزار ہوئی —— اور میں اُن سے ملے بغیر ہی واپس لوٹ آئی —— رہ رہ کر اُن کی باتیں کانوں میں گونجتیں —— اور مایوسی کا زہر میری رگ رگ میں پھیلنے لگتا —— وہ محبت کے معاملے میں کتنے غیر سنجیدہ ہیں —— اور میں کیسے اپنی زندگی اُن کے لیے تباہ کر رہی ہوں ——

پھر میں نے سوچا!

میں نے کسی دیوتا یا فرشتے سے تو محبت نہیں کی —— وہ انسان ہیں —— اور کوئی انسان خامیوں سے مبرّا نہیں ہوتا ——

ان میں کچھ خوبیاں ہیں ـــــ تو خامیوں کا ہونا بھی لازمی ہے ـــــ اور اگر میں اُن کا قرب چاہتی ہوں تو مجھے اُن کی خامیوں کو نظر انداز کرنا ہی پڑے گا ـــــ اب دُنیا کے سارے اچھے لوگ ہمارے دوست تو نہیں ہو سکتے نا ـــــ یہ بھی میرا ہی قصور ہے، کہ میں اُن کے ساتھ کسی خامی یا کسی بُرائی کا تصوّر تک نہیں کر سکتی ـــــ ان سے ایسی توقعات وابستہ کر لیتی ہوں، جن کا پُورا ہونا ممکن نہیں۔ اور پھر انھیں توقعات کی شکست مجھے نت نئے صدموں سے دوچار کرنے کا باعث بنتی ہے ـــــ اور میں پہروں غمگین رہتی ہُوں، کہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا ـــــ بہرحال اب مجھے اپنے آپ کو ہر امتحان کے لیے تیار رکھنا ہو گا ـــــ میں انھیں ہر قیمت پر محبت کی قدر کرنا سکھاؤں گی ـــــ چاہے مجھے کتنے دُکھ اٹھانے پڑیں۔ میں ہمّت نہ ہاروں گی ـــــ میں انھیں اپنے پیار سے جیت لُوں گی ـــــ اور پھر بتاؤں گی ـــــ کہ پیار میں یقیناً اِتنی قوّت ہے، کہ تم ایسے سرکش انسان کو بھی قابو میں لایا جا سکتا ہے ـــــ میں انھیں محبت کے رموز سے آگاہ کروں گی ـــــ آج میں انھیں اُن کی تمام خامیوں کے ساتھ قبول کرتی ہُوں۔

شام کو ـــــ شگفتہ ہوسٹل آ گئی ـــــ اُس کے آنے سے دل کسی حد تک بہل گیا۔

"آفس گئی تھیں؟" ـــــ باتوں باتوں میں میں نے پُوچھا۔

"کل گئی تھی، — احمر صاحب سے پروگرام کے متعلق کچھ پوچھنا تھا۔
"کون کون تھا وہاں"؟ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔
"کون نہیں تھا — اُن کے تمام دوست، کاشف — راحیل اور فراز سب ہی تو بیٹھے تھے، اور مس نور بھی تھیں — اور یہ عجیب اتفاق ہے، کہ میں جب بھی اس کمرے میں جاتی ہوں۔ وہ وہاں موجود ہوتی ہیں معلوم ہوتا ہے — مس نور احمر کو بہت پسند کرتی ہیں۔"
"وہ ہیں ہی ایسے"۔— بے ساختگی میں میرے ہونٹوں سے نکلا۔ لیکن میں جلد ہی سنبھل گئی۔
شگفتہ نے گھور کر مجھے دیکھا — لیکن میرے چہرے پر کوئی تاثر نہ پاکر مطمئن ہو گئی — کہنے لگی :
"ہاں — متاثر تو میں بھی ہوں اُن سے — واقعی بہنا۔ ہر فن مولا ہے یہ شخص — اداکاری دیکھو تو لاجواب، اُن کے لکھے ہوئے ڈرامے تو یقیناً تم نے بھی سنے ہوں گے — بہت اچھا لکھتے ہیں — اور پھر کبھی تمھیں ان سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہو، تو ایک بات نوٹ کرنا، کہ وہ ہر موضوع پر بلا تکان کئی کئی گھنٹے بول سکتے ہیں — میں اُن کی اِس خوبی کی تو دل سے معترف ہوں!"
شگفتہ مجھے ان کے بارے میں یوں بتا رہی تھی، جیسے میں انھیں جانتی نہ ہوں۔ میں دل ہی دل میں مسکرائی — اس بے چاری کو کیا خبر، کہ احمر کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔

"اچھا اور کیا خوبیاں ہیں اُن میں"۔ میں اُسے چھیڑنے لگی۔ لُطف آ رہا تھا اُس کی باتوں سے۔

"کپڑے کتنے صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے، جیسے ابھی ڈرائی کلین کی مشین سے نکل کر آ رہے ہوں۔ کپڑے سلے ہوئے بھی تو کتنے سلیقے سے ہوتے ہیں۔ نہ جانے کونسی خوشبو استعمال کرتے ہیں۔ احمر کے علاوہ وہ خوشبو میں نے کسی کو استعمال کرتے نہیں دیکھا — دراصل وہ ہر وقت اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہیں۔"

"شگفتہ تم اُن کی اتنی تعریفیں کر رہی ہو — اور مجھے "دال میں کچھ کالا" دکھائی دے رہا ہے۔"

"نہیں نہیں بینا — میرے جُملہ حقوق تو محفوظ ہو چکے ہیں۔ ویسے وہ لڑکی بڑی خوش نصیب ہو گی۔ جسے ایسا رفیقِ حیات ملے گا۔"

میرے جی میں آیا — میں اُس سے کہوں کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتا، اِس میں کوئی شک نہیں، کہ وہ ہمہ صفت موصوف ہیں — لیکن جب وہ دُکھ دینے پر آتے ہیں، تو ان کے دُکھ دینے کا انداز بھی نرالا ہوتا ہے اب اِن باتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہر ایک میں نہیں — لیکن میں نے کہا نہیں، چائے سے فراغت پائی۔ تو شگفتہ کہنے لگی:

"مجھے بازار کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔ اکیلے جاتے ہوئے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ تم بھی چلو۔"

میں نے بیگم اختر سے اجازت لی، اور بازار آ گئے۔ اُس نے کچھ

کپڑا لیا — پھر "ڈیکوریشن" کی چند چیزیں خریدنے کے ارادے سے ہم ایک بڑی دکان میں داخل ہوئے۔ چیزیں دیکھتے دیکھتے میری نگاہ ایک سگرٹ کیس پر پڑی۔ مجھے وہ خوبصورت لگا۔ میرا جی چاہا کہ احمر کے لیے لے لوں — مگر شگفتہ ساتھ تھی۔ اس لیے نہ لے سکی۔ اُس نے ڈیکوریشن پیس لیے، اور ہم گوشۂ راحت میں اپنے پسندیدہ پرچے دیکھنے کے لیے بڑھے۔ وہ جب کتابیں دکھا رہی تھی، تو میرا ذہن اسی — سگرٹ کیس میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے شگفتہ سے کہا:

"میں اپنے رومالوں والا پیکٹ وہیں بھول آئی ہوں، تم یہ دیکھو میں ابھی لے کر آتی ہوں — اسے وہاں چھوڑ کر میں دوبارہ اس دکان میں گئی۔ اور وہ سگرٹ کیس اور لائیٹر خرید کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

O

۲۰- فروری ۱۹۵۶ء

"تو ___ اُس روز تم کیا کہہ کر گئی تھیں ، کہ :

جو آپ کیا کرتے ہیں ، وہ ٹھیک نہیں یا جو مَیں سمجھتی ہُوں وُہ غلط ہے ! ___ یہی کہا تھا نا تُم نے" ___ انھوں نے میرے ہاتھ کو اپنے نرم ہاتھ میں لے کر کہا۔

"ہاں" ___

"تو کیا مطلب تھا تمھارا اِس سے ؟"

"اب سب باتیں بتانے کی تو نہیں ہوتیں نا ___ کچھ آپ خود بھی تو سمجھ لیا کریں۔" مَیں نے اُنھیں کا بار ہا کہا ہُوا جُملہ دُہرایا۔ اِک پل کو انھوں نے میری آنکھوں میں جھانکا اور کِھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہنستے وقت ان کے رخساروں میں دو ننھے گڑھے بن جاتے تھے اور ٹھوڑی کا خم اور گہرا ہو جاتا تھا۔ اس لمحے وہ کتنے دلکش لگنے لگتے تھے۔

مَیں نے جلدی سے ایک شعر پڑھا :

شاید تری ادا ہی کرے تجھ پہ کچھ اثر !
اس مصلحت سے تیری ادا ہو گیا ہُوں مَیں

"اوہو — آپ تو آج بڑے شاعرانہ موڈ میں ہیں۔"

"سب آپ کے قرب کا اثر ہے۔" میں جھینپ کر مسکرا دی۔

"کبھی کبھی تو — میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت انسان تصوّر کرنے لگتا ہوں۔"

"کس لیے!"

"بھئی — آپ جو میری اتنی تعریفیں کرتی ہیں — دراصل میں ایسا نہیں ہوں — جو آپ سمجھتی ہیں۔"

آج پہلی بار — احمر سنجیدگی سے اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔

"تو پھر کیسے ہیں؟" میں نے موقع غنیمت جان کر پوچھ لیا۔

"اب سب باتیں بتانے کی تو نہیں ہوتیں نا — کچھ آپ خود بھی تو سمجھ لیا کریں۔" ان کا وہی پرانا موڈ پلٹ آیا۔

میں نے بات بدل دی، — مجھے علم تھا، کہ اگر میں نے اصرار کیا — تو وہ کبھی بھی کچھ نہ بتائیں گے — عجیب ضدّی طبیعت ہے اُن کی۔

میں نے بیگ کھول کر — گلابی لفافہ نکالا، جس میں وہ — سگریٹ کیس اور لائٹر رکھا تھا۔

"یہ لیجیے — یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں!"

"کیا ہے؟"

"خود دیکھ لیں نا — میں نے لفافہ اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔

انھوں نے لفافہ کھولا، اور کہنے لگے:

"اب آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ یہ کام تو مجھے کرنا چاہیئے تھا۔"

"کون سا کام؟" میں نے پُوچھا۔

"یہی تحفے دینے کا۔"

"بہت سے ایسے کام میں کر رہی ہُوں۔ جو آپ کو کرنے چاہیئے تھے۔" دبے دبے لہجے میں میں نے کہا۔ یکایک مجھے انتظار کی کوفت، اور ملنے کی شدید خواہش کا خیال آ گیا تھا۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟"

"کچھ نہیں، یونہی — در اصل میں آپ کے لیے سگرٹ بھی لانا چاہتی تھی — لیکن دکان سے خریدتے وقت جھجک کر رہ گئی" — میں نے بات بدل دی۔

"چلیے کوئی بات نہیں — پھر کبھی لے آیے گا۔" انھوں نے سگرٹ کیس اور لائٹر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

"احمر — آپ کو کون کون سی چیزیں پسند ہیں؟"

"سونا!"

"سونا" — میں نے حیرت سے دُہرایا۔

"ہاں — مگر کون سا — بستر والا سونا — پہننے والا نہیں — سمجھیں!"

میں بے ساختہ مسکرا دی — اور — اور — اُنھوں نے باہر آسمان پر

چمکتے ہوئے چاند کو دیکھا، اور بول اُٹھے :

"چاندنی ——— اور ——— اچھی کتابیں!"

"اچھی کتابیں تو میری بھی کمزوری ہیں۔ کتابیں واقعی تنہائی کی بہترین رفیق ثابت ہوتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کو کون سا رائٹر پسند ہے؟"

"عبداللہ حسین اور عزیز احمد۔"

"عبداللہ حسین کی "اُداس نسلیں" تو میں بھی پڑھ چکی ہوں۔"

"کیسا لگا؟"

"اچھا تھا ——— مگر میں اُسے دُنیا کا عظیم ترین ناول نہیں کہہ سکتی۔"

"کچھ معلوم بھی ہے؟ اُسے آدم جی پرائز بھی مل چکا ہے۔" احمر بولے۔

"جانتی ہوں! مگر اپنی اپنی پسند ہے۔"

"آپ اُسے سمجھ نہ سکی ہوں گی ——— ورنہ بلاشُبہ وہ ایک عظیم تخلیق ہے۔" وہ اپنی پسند منوانے کے عادی تھے۔

"ایسا ہی ہُوا ہو گا۔" میں نے ہمیشہ کی طرح ہار تسلیم کر لی۔

"ہو گا نہیں ——— ایسا ہے" ——— وہ مُصِر رہے۔ میں مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

"عزیز احمد کا کوئی ناول پڑھا آپ نے!"

"نہیں ——— اتفاق نہیں ہُوا ——— اگر آپ کے پاس ہو تو مجھے پڑھنے کے لیے دیجیے۔"

"میرے پاس اُن کا ایک ناول "شبنم" ہے۔ کل جب آپ آئیں گی تو یاد دلا دیجئے گا ——— میری دراز میں ہی رکھا ہے۔"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر اُن کا بازو آگے بڑھا —— اور مَیں کٹی ہوئی شاخ کی مانند اُن کی آغوش میں آ رہی —— ان کے بدن سے آتی ہوئی، وہ مسحور کن خوشبو میرے احساسات پر حاوی ہوتی گئی۔ اور آنکھیں موند کر مَیں سوچنے لگی —— یہ لمحات —— کون جانے یہ لمحات پھر کبھی لوٹ کر آئیں گے بھی یا نہیں —— اب تو اِن باتوں پر یقین بھی نہیں آتا، ڈرتی ہُوں —— کہیں یہ ایک دلکش خواب کی مانند تو نہیں —— کہ آنکھیں کُھلیں تو سب کچھ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔

"پھر کب آؤ گے احمر —— کب آؤ گے؟" مَیں بے چینی سے اُن کے کالر کو مسلنے لگی —— وُہ مسکرائے۔

"حوصلہ —— حوصلہ —— کل پھر بھی آئے گی۔"

"کل ——" گھُٹے گھُٹے لہجے میں مَیں نے دُہرایا —— "کل کے بارے میں کون جانتا ہے —— اور پھر میرے لیے کل بالکل بے معنی ہے۔ کون جانے کل تک آپ مہربان رہیں —— نہ رہیں!"

○

۲۶- فروری ۱۹۵۶ء

بچپن سے پیار پانے کی ہر خواہش —— ہر کوشش ——
جس جس طرح سے ناکام ہوئی تھی۔ اُس نے میرے لاشعور میں ——
ٹھکرائے جانے کا خوف جاگزیں کر دیا تھا —— اور پھر —— اِس پر
احمر کا رویّہ —— مزید ستم کا باعث بنا —— ہر وقت ایک انجانا سا
خوف —— ایک نامعلوم سا وسوسہ —— مجھے ہر وقت بے چین رکھتا۔

کہیں احمر مجھے ٹھکرا نہ دیں!

پیار کی تِشنگی تو بھرپور پیار سے مِٹتی ہے —— اور احمر ——
ان کا پیار لمحاتی پیار تھا —— جب ان کا جی چاہتا —— وہ مجھ سے
مِلتے —— اور جب طبیعت مِلنے پر —— آمادہ نہ ہوتی —— وُہ
نہ آتے۔

ایک تشنگی تھی —— جو پیار اور لمس سے پہلے تھی —— ایک
تِشنگی تھی —— جو لمس اور قُربت کے وقت بھی باقی رہی —— اور ایک
تِشنگی تھی —— جواب بھی تھی —— لیکن ان تینوں پیاسوں کی
نوعیت مختلف تھی!

میری زندگی کا یہ دور — ایک ہیجانی دور تھا۔ جس میں انتہائی متضاد قسم کے جذبات، خیالات، شبہات، اُمیدیں، سُکھ اور دُکھ، ایک جنوں اندیش بھنور میں پھنسے ہوئے تھے۔

جب مجھے اُن سے ملنا ہوتا۔ تب بھی ایک ہیجانی کیفیت مجھ پر طاری رہتی، مَیں سوچتی — خدا جانے — وہ آئیں گے بھی یا نہیں — اور جب وہ میرے قریب ہوتے۔ تو مجھے ہر لمحہ یہ خیال رہتا، کہ پھر کبھی اس کے بعد مَیں اُن سے مل سکوں گی یا نہیں — یُوں — اُن کی قُربت میں بھی مجھے قرار نصیب نہ ہوتا — مَیں ان کے سینے میں مُنہ چھپائے — انھیں بے سر و پا خیالات سے اُلجھتی رہتی — اُن کے رویّے نے میرا اعتماد لُوٹ لیا تھا۔

ہر چند کہ وہ کہتے :

کل پھر بھی آئے گی — کل پھر بھی آئے گی !

لیکن مجھے یقین نہ آتا — میرا ذہن مجھ سے کہتا :

کل کا کیا اعتبار — آئے یا نہ آئے۔ تب مَیں اُن سے لپٹ جاتی — ان کی ایک ایک چیز کو یُوں دیکھتی، جیسے آج کے بعد پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ میری بے تابی — میری بے قراری دیکھ دیکھ کر وہ مسکراتے رہتے — لیکن میرے دل و دماغ میں جو طوفان مچل رہے ہوتے — اُن سے بے خبر رہتے مَیں اُن کے سینے میں منھ چھپائے بے ثمر خیالوں سے اُلجھتی رہتی — اکمر! — تم نے مجھ سے میرا اعتماد کیوں چھین لیا — اب مَیں کسی شے پر بھروسہ

نہیں کر سکتی — آج اور کل میں کتنا فرق ہے — کتنا فاصلہ ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے — میں دُکھی دل سے سوچتی — اور میرا جی چاہتا — میں پھُوٹ پھُوٹ کر رو لُوں — تاکہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے — لیکن اُن کے سامنے — اپنی کمزوری کا میں اظہار نہ کرنا چاہتی تھی — اور یہ بوجھ — یہ دُکھ — یہ بے اعتمادی — میرا مقدر بن گئی تھی — اس سے مفر تھی نہ نجات!!

۲۸- فروری ۱۹۵۶ء

آج عید ہے —— ساری دنیا اپنی خوشیوں میں مگن ہے، اور میں اپنا کمرہ بند کیے اپنے آپ سے اُلجھ رہی ہُوں۔ آج ممی مجھے بے طرح یاد آرہی ہیں، اور آنسو میری پلکوں کے بندھ توڑ کر بہہ نکلے ہیں۔ ہر عید پر ممی مجھے ملنے ضرور آتی تھیں —— اور جب حالات ذرا ٹھیک ہوتے۔ پاپا کا موڈ اچھا ہوتا۔ تو وہ مجھے گھر لے جاتیں —— وہ مجھے نیا جوڑا پہناتیں —— اپنے ہاتھوں سے میرے بال سنوارتیں، سویّوں کا حلوہ کھلاتیں —— اور عیدی دیتیں۔ جب میں کہتی —— ممّی، میں کوئی بچّہ تھوڑی ہُوں۔ جو آپ مجھے عیدی دیتی ہیں —— تب وہ مسکرا کر ہولے سے سر تھپتھپاتی اور کہتیں: تم چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جاؤ، میرے لیے تو وہی ننھی منھی بینا رہو گی۔ جو میری آغوش میں آتے ہی سکون سے سو جاتی تھی۔

ہائے ممی —— اب تمھیں بینا کا خیال نہیں آتا —— تمھاری بینا کتنی اکیلی کتنی تنہا ہے۔ کوئی بھی تو اس کا نہیں —— تم کہاں چلی گئیں ممّی —— کہاں کھو گئیں —— میرا دل غم سے بوجھل ہو رہا ہے —— اور آنسو میرے رخساروں کو بھگوتے چلے جاتے ہیں۔

ایک بجے بیگم اختر زبردستی ساتھ لے گئیں۔ میرا منھ ہاتھ دُھلوایا اور لباس تبدیل کرنے پر اصرار کرنے لگیں۔ اپنے سامنے کپڑے نکلوائے، اُن کے زور دینے پر مَیں نے گلابی رنگ کا سُوٹ پہن لیا۔ ہوسٹل کی لڑکیاں ملنے کے لیے آنے لگیں۔ تب کہیں جا کے خیالات بٹے۔

آج شام کو احمر سے ملنا تھا —— مَیں نے چپراسی کو پانچ روپے بطورِ انعام دیے —— اور کچھ مٹھائی اور ۵۵۵ کے سگرٹ احمر کے لیے منگوائے۔ شام کے چھ بجے مجھے فراز کی موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ مَیں نے سیاہ شال شانوں پر لپیٹا —— اور باہر نکل آئی۔ احمر آج موٹر میں پہلے سے موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہا :

"عید مبارک!"

جواباً مَیں نے بھی اُنھیں اور فراز کو عید مبارک کہا۔

موٹر کے شیشے بند تھے۔ لیکن اِس کے باوجود سردی بے حد تھی۔ احمر نے اپنا اوور کوٹ میرے پیروں پر پھیلا دیا۔

سڑکوں پر آج خوب رونق تھی۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک سب نے ہی حسبِ توفیق اچھا لباس پہنا تھا۔ کہیں کہیں میدانوں میں جھُولے وغیرہ لگے تھے۔

شہر سے دُور پہنچ کر فراز نے گاڑی روکی، اور تھرماس نکالی۔ مَیں نے مٹھائی کا پیکٹ اُسے دے دیا۔ فراز نے کھول کر دیکھا۔ اور احمر سے کہا :

"بڑے شرم کی بات ہے —— ان باتوں کا خیال —— تو ہمیں رکھنا چاہیئے تھا۔"

"آپ دوسری باتوں کا جو خیال رکھتے ہیں —— وہ کیا کم ہیں۔" میں جلدی سے بولی۔

جب سگرٹ احمر کو دیے، تو ہنسنے لگے —— کہنے لگے:

"ارے، آپ تو واقعی لے آئی ہیں۔ میں نے تو اُس روز مذاق کیا تھا —— آج کیسے منگوائے۔"

"چپراسی سے!"

"اور اگر وہ کسی سے کہہ دے تب!" شرارت سے بولے۔

"وہ نہیں کہے گا —— رشوت جو دے دی تھی —— کیا وہ اُس کی زبان بند کرنے کے لیے کافی نہیں۔" دو گھنٹے تک ہم لوگ ساتھ رہے، اور دن کا بقایا حصّہ قدرے بہتر گزرا۔

○

۱۵- مارچ ۱۹۵۶ء

شگفتہ کل آئی۔ تو کہنے لگی :

"کچھ معلوم بھی ہے بیٹا —— احمر کے ٹرانسفر کی افواہ پھیل رہی ہے ممکن ہے۔ کہ وہ چلے جائیں۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا —— خدا نہ کرے —— کہ وُہ چلے جائیں۔ اگر وہ چلے گئے —— تو میرا کیا بنے گا۔ مَیں اُن کے بغیر —— کیسے رہ سکوں گی! چاہے وہ جیسے بھی ہیں —— میرے ہیں۔ مَیں اُنھیں یہاں دیکھ تو سکتی ہُوں۔ مِل تو سکتی ہُوں۔ میرے جِینے کے لیے یہی سہارا کافی ہے۔ اگر وُہ چلے گئے —— تو یہ سہارا بھی چِھن جائے گا۔ —— اور بغیر سہارے کے زندگی گزارنا کِتنا مشکل ہوتا ہے —— یہ مَیں جانتی ہُوں۔ اب میرا دُنیا میں ہے ہی کون؟

پاپا نے شادی کر لی —— اور بیگانے بن بیٹھے —— ممی تو مجھے دنیا والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پہلے ہی سے جا چکی تھیں —— اب اور کون ہے، جسے مَیں اپنا کہوں —— اپنا سمجھوں —— جو میرے دُکھ درد اور خوشیوں کا ساتھی بن سکے۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں

کی اِس دُنیا میں —— میرا اپنا —— کوئی نہیں —— کوئی بھی نہیں ——

احمر کو پاکر مَیں نے سمجھا —— مجھے کائنات مِل گئی —— اگر وہ میرے ساتھ رہیں —— میرے قریب رہیں —— تو مَیں اپنے تمام دُکھوں —— تمام محرومیوں کو بھُول جاؤں۔

یہ درست ہے، کہ متعدد بار انھوں نے "نہ آکر" مجھے رنج پہنچایا ہے —— میرے دُکھ میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن اِن گھور تاریکیوں میں ایک اُمید —— ایک دُھندلے ستارے کی طرح اب بھی روشن ہے، —— وہ پھر آئیں گے —— شاید کبھی وہ میری محبت کی گہرائی کو سمجھ سکیں —— کبھی وہ مجھے گلے سے لگاکر کہیں:

بہت ہو چکا بیٹا —— مَیں نے تمھیں بہت دکھ دیئے ہیں —— لیکن اب اُنھیں فراموش کر دو —— اور آؤ —— کہ مِل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔ جہاں چاند چمکتا ہے، بہاریں گنگناتی ہیں۔ شفق کا رنگین آنچل ہمارے سروں پر سایہ کناں رہے —— جہاں سُورج کی پہلی کرن معصوم کلیوں کو چومتی ہے —— وہیں ہم فضاؤں میں —— اپنے پیار کے نغمے بکھیریں۔

یہ اُمید —— یہ آس —— میرے دل کے ہر دُکھ —— ہر غم پر مرہم کا کام دیتی۔ میرے دل کو ایک نئے عزم —— نئے حوصلے —— نئی آرزوؤں سے لبریز کر دیتی ہے!

اور میں سب کچھ بھول جاتی!

لیکن یہ شگفتہ کیا کہہ رہی ہے:

شاید وہ چلے جائیں!

اگر ایسا ہو گیا۔ تو میں انھیں کہاں ڈھونڈ پاؤں گی — کیسے تلاش کروں گی — کس اُمید — کس آسرے پر زندگی کا یہ طویل اور بے کیف سفر طے کروں گی — میرا دل رنج و غم سے پھٹنے لگا۔ اور میں مبہم سی دُعائیں مانگنے لگی — خدا کرے یہ جھوٹ ہو — یہ جھوٹ ہو —

شام کو میں اُن سے ملنے گئی۔ تب میں نے پوچھا:

"میں نے سُنا ہے کہ آپ کا ٹرانسفر ہو رہا ہے"

کہنے لگے:

"کچھ ایسی ہی خبر میں بھی سُن رہا ہوں!"

"خدا کرے یہ خبر غلط ہو" —

شرارت سے بولے:

"اور اگر یہ سچ ہوئی تو —؟"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے — گھُٹی گھُٹی آواز میں میں نے کہا:

"تب آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جایئے گا — آپ کا کھانا پکا دیا کروں گی — کپڑے دھو دیا کروں گی — آپ کے

سارے کام کر دیا کروں گی۔"

حیران ہو کر انھوں نے مجھے دیکھا۔

پھر کہنے لگے :

" ارے —— آپ اِتنے اعتماد سے کہہ رہی ہیں ، سارے کام کر دیا کروں گی —— ساری عمر تو آپ ہوسٹل میں رہیں —— کھانا پکانا کیا آتا ہوگا۔"

" ہوسٹل میں رہی تو کیا —— چھٹیوں میں جب گھر جاتی تھی — تب سیکھ لیا تھا۔"

شرارت سے ہنس کر بولے :

" اب جب یہ کہہ ہی چکی ہو ، تو بتاؤ — کیا تنخواہ لوگی ؟"

" صرف آپ کی نظرِ عنایت چاہیئے مجھے !" آہستگی سے مَیں نے کہا اور اپنے اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

تب وہ ہولے سے بولے :

" خوش ہو جاؤ — یہ افواہ غلط ہے — ٹرانسفر ہوا ضرور تھا — لیکن کوشش کر کے مَیں نے رکوا لیا ، اور اب ایسا کوئی ارادہ نہیں۔

○

کچھ ایسی ہی عادت تھی اُن کی ! —— پہلے وُہ مجھے بالکل

مایوس کر دیتے ۔۔۔ اور جب دیکھتے ۔۔۔ کہ اب مَیں بالکل مایوس ہو چکی ہوں ۔ تب وہ ایک فقرے ، یا ایک لفظ سے میرے دل میں اُمید کی ایک کرن روشن کر دیتے ۔۔۔ پہلے خوب خوب ۔۔۔ پریشان کرتے ۔۔۔ اور جب خیال آتا ، کہ مَیں تھک گئی ہوں ۔ تب وہ اپنے لطیف مزاح سے مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتے ۔

بیک وقت ، وہ نفی و اثبات کی علامتوں سے کام لے کر اپنی جستجو کرنے والوں کو مغالطوں میں ڈال کر لطف لیتے ۔۔۔ اور یُوں مَیں ان کے رویّے سے کچھ اَخذ نہ کر سکتی ۔۔ وہ محبت کرتے ہیں یا نفرت ۔۔۔ مَیں سمجھ نہ پاتی ۔۔ ان کا ایک دن کا رویّہ گہری اپنائیت لیے ہوتا ، اور دوسرے دن کا رویّہ اپنے جلو میں برف ایسی سرد مہری ۔ اور ۔۔ یُوں مَیں کچھ فیصلہ نہ کر سکتی ۔

ان کے ہشاش بشاش اور دلکش وجود میں ، چالاکی ، بے نیازی بناوٹ اور سادگی ، سکون اور وحشت کی ایک مسحور کن گھلاوٹ تھی ۔ وہ کچھ بھی کہتے یا کرتے ۔۔ اُن کی ہر ادا ۔۔ ہر انداز ۔۔ میں ایک عجیب قوّت ، اپنا جادو جگا رہی ہوتی ۔ ان کے مستقل بدلتے ہوئے رنگ میں ایک عجیب سیمابی کیفیت تھی ۔ اُس سے بیک وقت ، جنون و فکر ۔ جذبات کی گرمی ۔۔۔ اور سرد مہری کا اظہار ہوتا تھا ! ۔۔ اُن کو سمجھنا بہت مشکل تھا ۔ تبھی تو ایک سال گزر جانے کے باوجُود ۔۔ مَیں اُن کو صِرف اُتنا ہی جانتی تھی ۔۔۔ جتنا کہ پہلے روز ۔۔ یُوں لگتا تھا ۔۔۔

جیسے اُن کی سرکش شخصیّت کسی عظیم فتح کی متلاشی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے انوکھے فیصلوں سے پُرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ــــ اور پھر یُوں بن جاتے ــــ جیسے یہ سب کچھ انھوں نے نہ کیا ہو۔ بلکہ کسی اور نے کیا ہو، ــــ جس سے انھیں کوئی واسطہ، ــــ کوئی غرض نہ ہو ــــ وہ ہر اُس چیز سے تنگ آجاتے، جو انھیں اپنا پیچھا کرتی محسوس ہوتی، اور جو ان کی منھ زور شخصیّت کی راہ میں ــــ حائل ہونے لگتی ــــ وہ اُن چیزوں کو کبھی اہمیّت نہ دیتے ــــ جو انھیں آسانی سے ــــ اور بغیر جدو جہد کیے حاصل ہو جاتیں ــــ چاہے وہ کتنی ہی انمول اور قیمتی کیوں نہ ہوں ــــ ان کی نظر میں وہ کوئی اہمیت نہ رکھتیں!

اور شاید اسی لیے ــــ وہ مجھے اہمیّت نہ دیتے تھے ــــ مَیں جو انھیں بغیر کسی کوشش ــــ بغیر کسی کاوش کے حاصل ہو گئی تھی ــــ جس کے لیے انھیں نہ انتظار کی سختیاں جھیلنی پڑیں ــــ نہ ہجر و فراق کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا ــــ مجھے تو وہ اشارتاً بھی بلاتے ــــ مَیں مسرّت سے بے قابو ہو کر چلی آتی ــــ مَیں نے کبھی انکار نہ کیا۔ کبھی اُن کی کسی خواہش کو رد نہ کیا ــــ وہ جو کہتے ــــ مَیں کرنے لگتی ــــ مَیں نے ــــ اُنھیں کبھی نظر انداز نہ کیا تھا۔ مَیں تو اُنھیں اپنے آپ سے بھی ــــ زیادہ چاہتی تھی ــــ مَیں اُن کے دیے ہوئے ــــ ہر زخم ــــ ہر دُکھ ــــ ہر غم کو

خاموشی سے سہہ لیتی تھی ۔ میں نے کبھی ان سے نہ پوچھا تھا۔ مجھے وہ اذیّت کیوں دیتے ہیں ؟ وہ مجھے نظرانداز کیوں کرتے ہیں ؟

اور میرا یہ صبر ——— یہ خاموشی ——— انھیں مجھ سے بیزار کرتا گیا ——— اور میں یہ سوچ کر خوف زدہ رہی ——— کہ اگر میں نے ان سے کچھ پوچھا ——— تو وہ ناراض ہو جائیں گے ۔ مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرلیں گے ، اور میں اُنھیں کھونا نہیں چاہتی تھی ——— کسی قیمت پر نہیں ——— اپنی زندگی ہار کر بھی نہیں !!

○

۱۰- اپریل ۱۹۵۶ء

آسمان پر پونم کا چاند چمک رہا تھا ــــــ آخیر سردیوں کی رات بھیگی چلی جارہی تھی ــــ کائنات پر چاندنی کا گھُلا گھُلا نور فسوں کا جال پھیلائے ہوئے تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کی سرگوشیاں پُراسرار ہوتی چلی جا رہی تھیں ــــــ رات کی رانی کی مسحور کن خوشبو ہواؤں کے دوش پر تیرتی ہوئی ہمارے قریب آگئی تھی۔

احمر میرے قریب بیٹھے تھے ــــــ اور اُن کی محبت کی ٹھنڈی، پُرسکون اور رُوح پرور روشنی میرے دل و دماغ کو منور کر رہی تھی۔ چاند کی ایک روشن کرن ان کے چہرے کو چھُو رہی تھی ــــ اُن کے گریبان کے اگلے دو بٹن کھُلے تھے۔ اور قمیض کے سفید کالر سے اُن کی گردن کا سیاہ تل جھانک رہا تھا ــــــ بے اختیار ہو کر مَیں جھکی ــــ اور مَیں نے اپنے ہونٹ اُس تل پر رکھ دیے ــــ میرے ہونٹوں تلے ــــ گرم جلد کی تہہ میں ایک رگ ــــ کانپ رہی تھی ــــ وہ ہولے سے مسکرائے ــــ اور مجھے بازوؤں کا سہارا دیا، ــــــ کبھی کبھی وہ کتنے مہربان ــــ کتنے نرم دل ــــ

اور کتنے اپنے لگنے لگتے ہیں —— ایسے لمحات میں —میں بالکل —— بے قابو ہونے لگتی ہوں ! مجھے اپنے —— جذبات —خیالات —— احساسات پر کوئی اختیار نہیں رہتا —— اُن کے ہاتھ کے لمس سے میرا سارا جسم جذبات کی شدت سے ایک شعلے کی طرح بھڑک اُٹھتا ہے —— تب مجھے ساری کائنات —— ایک اَن سُنے نغمے میں تحلیل ہوتی محسوس ہوتی ہے —— میرے اندر کا مُرجھایا ہُوا پھول —— پھر سے کِھلنے لگتا ہے —— اُن کے شانوں پر جُھک کر —— میں نے دھیرے دھیرے کہا :

تم ہی میری زندگی کا سنگیت ہو —— میرے پھولوں کی خوشبو! اور میرے آسمان کا آفتاب ہو۔

تم سے ہی میری زندگی میں اُجالا ہے —— میری کائنات روشن ہے —— تمھارا پیار میرا حاصلِ حیات ہے —— مجھے اِس پیار سے کبھی محروم نہ رکھنا۔

مجھ سے میری مسرتیں نہ چھیننا احمر —— !

اگر تمھارے مضبوط بازوؤں کا سہارا مجھے حاصل رہے —— تو میں زندگی کے طوفان میں ہنستے مسکراتے اپنا سفر طے کرلوں گی، میں تمھاری رفاقت میں —— دنیا کی ہر تکلیف —— ہر مصیبت کا سامنا —— کرسکتی ہوں —— مجھے اپنے سے کبھی الگ نہ کرنا، کبھی جُدا نہ کرنا۔

وہ ہولے ہولے مسکراتے رہے —— ان کی اُنگلیاں —— میرے بالوں سے کھیلتی رہیں —— اور وقت دبے پاؤں اپنا سفر طے کرتا رہا!

انھوں نے گاڑی میں نصب ریڈیو کھولا —— لیکن کہیں سے کوئی اچھا پروگرام سنائی نہ دیا۔

کہنے لگے:

"تم ہی کچھ سناؤ بیٹا!"

مَیں اُن کی خواہش ردّ نہ کرسکی —— اور قتیل شفائی کی یہ غزل سنانی شروع کی:

مجھے آرزو تھی جس کی وہ پیام آگیا ہے
مرے دل کی دھڑکنوں میں ترا نام آگیا ہے
یہ کہاں نصیب میرے کہ تو آپ چل کے آتا
کوئی جذبۂ محبت مرے کام آگیا ہے
مَیں کروں جو پیار تجھ سے تو بُرا نہ مان لینا
جہاں دل رہے نہ بس میں، وہ مقام آگیا ہے

مَیں نے غزل ختم کی —— تو شرارت سے بولے:

"کسے سمجھا رہی تھیں ——؟ کسے سُنا رہی تھیں ——؟ کیا مجھے ——؟"

مَیں شرمندہ سی ہوگئی ——

انھوں نے سگرٹ کا بھرپور کش لیا ——— اور دُھواں میرے چہرے پر بکھیر دیا۔

کہنے لگے:

"تمھاری آواز تو بہت اچھی ہے۔ ایک بار پھر ہو جائے۔

کیا چیز ——— ؟

یہی غزل ——— !

ان کے اصرار پر یہی غزل میں نے ایک بار پھر سنائی ——— اور سوچنے لگی ——— زندگی کے یہ لمحات آخر منجمد کیوں نہیں ہو جاتے؟ ٹھہر کیوں نہیں جاتے!

○

۱۰- اپریل ۱۹۵۹ء

لیکن وقت گزرتا گیا —— ماہ و سال کی گردش جاری رہی۔

موسم بدلتے رہے!!

کبھی بہاریں اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتیں ——

اور کبھی خزاں کا بے کیف موسم —— اپنی تمام تر ویرانیوں کے ساتھ آ دھمکتا ——

تین سال گزر گئے۔

کتنی بہاریں آئیں —— اور بیت گئیں —— لیکن احمر کی شخصیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، —— وہ جیسے تھے —— ویسے ہی رہے میری محبت کی شمع انھیں پگھلا نہ سکی —— وہ اپنی ہی بنائی ہوئی راہ پر گامزن رہے —— میری محبت اُنھیں نہ جیت سکی —— اُن کا رویّہ اب بھی وُہی تھا —— جو تین سال پہلے تھا —— وہ میرے لیے آج بھی ویسا ہی الجھا ہوا مسئلہ بنے ہوئے تھے —— جیسا کہ میں تین سال قبل محسوس کرتی تھی —— وہ آج بھی وہی کچھ کرتے تھے جو اُن کا دل چاہتا تھا۔ جب جی چاہتا وہ مجھ سے ملنے آتے، اور

جب جی نہ چاہتا ـــــ وہ نہ آتے ـــــ وہ بہار کے رنگین دنوں میں "نہ مِل کر" میرا یہ احساس گہرا کر دیتے ، ـــ کہ زندگی ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہیں ـــــ اور خزاں کے سِسکتے دنوں میں میرے قریب آکر احساس دلاتے ، کہ زندگی اتنی رنگین اتنی خوبصورت بھی ہوسکتی ہے ـــــ اور میں اِن متضاد باتوں کی بھول بھلیوں میں گُم ہوکر رہ جاتی ، اپنا راستہ بھی بھول جاتی ـــــ

بارہا ـــــ ایسا ہُوا ، ـــ کہ انھوں نے مجھے بُلایا ـــــ اور خود نہ آئے ـــ تب گھنٹوں انتظار کی جان لیوا تکلیف کے بعد ـــــ میں انھیں دیکھنے کے لیے آفس گئی ـــــ ایک مبہم سی آس کا سہارا لے کر ـــــ شاید وہ بیمار ہوں ـــــ شاید کوئی مجبوری اُن کی راہ میں حائل ہوگئی ہو ـــــ

لیکن جب بھی میں وہاں پہنچی ـــــ وہ ویسے ہی تندرست وتوانا اور ہشاش بشاش مِس نُور سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے نظر آئے ـــ ان لمحوں میں میرے غصّے کے جذبات انتہائی شِدّت اختیار کر لیتے ـــــ اپنی توہین ـــ اپنے ٹھکرائے جانے کا زہر آلود احساس ، میری رگ رگ میں گردش کرنے لگتا ـــــ میرے اعضاء ـــــ مجُھے یوں لگتا ـــ جیسے میرے قابو میں نہ رہیں گے ـــــ میری انتقامی حِس کہتی ـــ کہ سامنے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھاؤ ـــ اور اُن کے سر پہ دے مارو ـــ انھیں میری زندگی سے کھیلنے کا حق کس نے

دیا ہے؟ ــــ یہ اپنا خطرناک ــــ اور دل شکن مذاق ختم کیوں نہیں کر دیتے ــــ؟

یہ لمحے انتہائی جان کنی کی سی کیفیت لیے ہوتے تھے ــــ میرا ذہن شعلوں کا آتش کدہ بن جاتا ہے ــــ جس میں میرے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں جل کر بھسم ہو جاتیں ــــ مجھے نہیں معلوم، میں کس طرح ضبط کرتی تھی ــــ کس طرح صبر کرتی تھی ــــ کوئی نامعلوم قوت مجھے روک لیتی تھی ــــ ورنہ ــــ میں بھی انسان تھی، اور ہر انسان کی طرح اپنی توہین کا احساس مجھے بھی ہوتا تھا ــــ اور میں اپنے اندر بدلہ لینے کا ایک سرکش اور تند جذبہ بھی محسوس کرتی تھی۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہتی ــــ اور جب یہ طوفان مجھ پر سے گزر جاتا ــــ تب میں کہتی ــــ میں انھیں معاف کرتی ہوں کہ سزا دینے سے معاف کر دینا زیادہ مشکل، زیادہ ناممکن ہے۔

اور میں انھیں سچے دل سے معاف کر دیتی، کہ محبت انتقام نہیں لیا کرتی، اور نہ ہی محبت دلوں میں مٹ جانے والے داغ چھوڑا کرتی ہے لیکن اُن کے اس رویّے نے مجھے ایسی بے یقینی، بدگمانی اور بے زاری عطا کر دی تھی، کہ مجھے کسی چیز پر یقین نہ آتا تھا ــــ یہ بات کہ

"محبت میں کشش ہوتی ہے۔ سچّی محبت دوسرے فریق کے دل میں بھی [illegible] کیے بغیر نہیں رہتی" ــــ مجھے محض [illegible] معلوم ہوتی۔

اگر یہ صحیح ہے، تو میرے جذبے، میری محبت، میری لگن، اور اس

سچائی سے، جس سے مَیں نے احمر کو چاہا تھا — پیار کیا تھا — پوجا تھا کوئی اور جذبہ، کوئی اور محبت اتنی سچّی، اتنی دیرپا ہو سکتی ہے یا نہیں ہرگز نہیں — یہ مَیں جانتی ہوں — یہ مَیں سمجھتی ہوں کہ مَیں نے انھیں اپنے دل کی کن گہرائیوں سے چاہا ہے۔ لیکن میری محبت، میرے جذبے کی شدّت، میری بے قراری — میری مایوسی، میرا اضطراب اُن پر کچھ اثر نہ کر سکا — وہ پتھّر کی اُس چٹان کی مانند رہے، جو لاکھ طوفانوں کے بعد بھی اپنی جگہ اسی طرح مضبوطی سے کھڑی رہتی ہے، — جس پر موسموں کا تغیّر و تبدل، — سردی — گرمی — برف باری اور لُو کے طوفان بھی کوئی نقش نہیں چھوڑ سکتے۔

انتظار — مسلسل انتظار — نے مجھ سے میری زندگی کی تمام مسرتیں چھین لی ہیں — آخر میں کب تک انتظار کروں — کب تک صبر کروں — کہ اس پتھر کے مجسّمے میں بھی حرکت پیدا ہو — کبھی محبت کی کوئی کرن اُس کے دل کو بھی روشنی سے منور کر دے — کبھی اُس کی آنکھیں — میری آنکھوں میں اُمنڈتے ہوئے چاہت کے طوفان کو دیکھ سکیں — محسوس کر سکیں!!

کب ہو گا ایسا — آخر کب ہو گا — ؟ جب میری تمام — آرزوئیں — تمام تمنائیں، تمام خواب مر جائیں گے — تب ایسا ہو گا۔ پھر یہ کس کام کا — کیا وہ نہیں سمجھتے — کہ نازک ٹہنی لچک دار ضرور ہوتی ہے۔ مگر جب اُس کی برداشت سے

زیادہ بوجھ ہو — تو وہ ٹوٹ بھی جاتی ہے، اور جب — ڈال ٹوٹ جائے۔ جب پھول شاخ سے گر پڑے — تو پھر دوبارہ شاخ سے نہیں لگایا جا سکتا۔ خواب جب ایک دفعہ برہم ہو جائے، تو پھر کون اُسے پھر سے مربوط کر سکتا ہے — ٹوٹی بینا سے سنگیت کا ایک سُر بھی بول نہیں سکتا — وہ یہ سب کیوں نہیں سمجھ جاتے — کیوں نہیں جان جاتے۔

○

یکم مئی ۱۹۵۹ء

اب میرے پاس صرف اکھڑی ہوئی ویران سوچیں ہی رہ گئی تھیں۔ جن کا تعلق ستاروں کی اَن دیکھی بستیوں سے تھا۔ بستیاں جو پلک جھپکتے آباد ہو جاتی ہیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُجڑ بھی جاتی ہیں۔

اپنی ویران سوچوں کی یلغار سے گھبرا کر" بارہا" مَیں نے اُن لمحوں میں، جب مَیں اُن کے بازوؤں کے حلقے میں تھی —— مَیں نے دعا مانگی —— اے خدا! مَیں تجھ سے کچھ نہیں مانگتی۔ بس اسی لمحے میری جان لے لے۔ ان بازوؤں کے حلقے میں مجھے ہمیشہ کے لیے سو جانے دے —— اس طویل تاریک رات میں ایسی زندگی کا سفر اگر اپنے محبوب کی بانہوں میں کٹ جائے، تو موت اس کشمکش اور اُمید و بیم کی زندگی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو جائے۔

لیکن میری کوئی دعا قبول نہ ہو سکی۔ وہ میرے نہ بن سکے اور نہ ہی مجھے موت آئی، کہ دُنیا جہاں کی محرومیاں میرا مقدر بن چکی ہیں —— اور جو دکھ قسمت میں لکھے جا چکے ہیں —— ان سے فرار کسی صورت میں ممکن نہیں۔

دن رات کا جانکاہ تسلسل —— جھُوٹی ہنسی —— مصنوعی باتیں ——

میں ان سب سے بیزار ہو چکی ہوں۔ بھلا یہ جینا بھی کوئی جینا ہے، من کے مندر کب سے سُونے پڑے ہیں، کہکشاں کے راستوں پر دھول اُڑا کرتی ہے، اور من کی آشائیں دُھندلی ہو کر مایوسی کے ساگر میں ڈوبتی چلی جا رہی ہیں۔ صرف دو نگاہیں ہیں جو پلکوں کی منڈیروں پر آنسوؤں کے دیے جلائے اب بھی منتظر ہیں، شاید —— دُعاؤں کو اثر مل جائے۔ شاید کوئی اپنا بن جائے —— غم کی تیز ہواؤں میں آس کا یہ دیپ مجھے کب تک جلائے رکھنا ہو گا! کون جانے ——

میں نے لاکھ سنجیدگی کا لبادہ پہنا۔ ہزار خود کو دنیا کی الجھنوں میں الجھایا، لیکن دامنِ دل سے خارِ مغیلاں کی طرح لپٹی ہوئی خواہشات کو ختم نہ کر سکی، کاش میں نے وہ خواب نہ دیکھے ہوتے، جن کی تعبیر سے میں آج یوں پشیمان ہوں۔ میں کیا جانتی تھی، کہ دل کا نازک آبگینہ یُوں چُور چُور ہو گا۔ کہ اس کی بکھری ہوئی کرچیں سمیٹتے سمیٹتے میرا —— احساس زخمی ہو کر رہ جائے گا۔

تنہائیوں کے اذیّت ناک لمحوں میں یہ رگ پُوری جلن کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ نہ ختم ہونے والی رات کے سنّاٹوں میں جب نیند کے سائے ہر ذی روح کو اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں۔ جب کوئی آواز —— کوئی حرکت میرا دھیان بٹانے کو بیدار نہیں ہوتی، تو میرا وجود تنہائی کی جاں گسل آگ میں تپنے لگتا ہے۔ میرا ذہن، میرے خیالات، اس تپش میں پگھلنے لگتے ہیں۔ دریچے سے آتی ہوئی چاندنی کی اداس کرنیں بے پناہ یادوں کے ظالم قافلے لیے

ساتھ چلی آتی ہیں۔ اُف —— میں کہاں تک ضبط کروں، کہاں تک صبر کروں۔ کس کس چیز کو بھلا دوں، ان کے ساتھ کو بھلا دوں۔ ان کی مدہوش کن قربت میں بتائے ہوئے وہ مختصر خمار آلود لمحے بھلا دوں۔ ان کو، جو مجھے نئے سرور سے آشنا کر کے عمر بھر کے لیے زندگی کے تپتے ہوئے ریگستان میں تڑپنے کو چھوڑ گئے ہیں —— کیسے بھول جاؤں! کیسے!! ایک خراش کا مٹانا مشکل ہوتا ہے —— یہاں تو زخم ہی زخم ہیں —— یہ کیسے بھر جائیں گے۔

دھندلے خوابوں اور کہر آلود مناظر کا طلسم اب ٹوٹ رہا ہے، اور حقیقت کے زہر نے تخیّل کی فضاؤں کو مسموم کر دیا ہے —— سکون و قرار کا منبع اعظم کہاں ہے؟ —— کہاں ہے؟

۱۵- جون ۱۹۵۹ء

اندوہ اور غم احساس کو شدید بنا دیتے ہیں، اور میں کتنی حساس ہوگئی ہوں —— اور میری زندگی اسی حساسیت کی بھینٹ چڑھتی جارہی ہے دورِ شباب میں بھی اسی ایک غم نے مجھے ویران کر رکھا ہے۔ ان کی دی ہوئی خلش نے مجھ سے میری خوشیوں کا ایک ایک لمحہ چھین لیا ہے۔

ان کے دل میں میرے لیے محبت کا جذبہ ایک بار بھی بیدار نہ ہو سکا —— سوکھے بادلوں سے میرے لیے پیار کی ایک بوند بھی نہ برسی —— اور میں پیاسی دھرتی کی مانند ویران —— اور بنجر پڑی رہی!!

کاش —— وہ میرے دل میں بھڑکتے ہوئے ان شعلوں کی تپش ایک بار —— صرف ایک بار محسوس کر سکیں! جو مجھے جلا کر خاکستر کیے دیتے ہیں —— جب لوگ آپس میں پیار کی باتیں کرتے ہیں —— تو یہ پیار میری آنکھوں کو نم کر دیتا ہے —— مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے میں کوئی بھکارن ہوں —— محبت کی ازلی بھکارن —— جو پیار کی تشنگی لیے ویران راہوں میں بھٹکتی پھر رہی ہے!!

اگر انھوں نے میرے دل پہ محبت کا پھاہا رکھا ہی تھا —— تو پھر وہ اپنی

دی ہوئی مسرتیں مجھ سے کیوں چھین لیتے ہیں۔ وہ مجھے اِس اذیّت میں ہی مبتلا کیوں رکھتے ہیں! اُمید و بیم کی اس کشمکش میں مبتلا کر کے وہ کیسا لطف لے رہے ہیں —— آخر وہ ایک ہی بار میرے کیوں نہیں ہو جاتے —— مجھے کیوں اپنا بنا نہیں لیتے —— اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر مجھے مایوس ہی کیوں نہیں کر دیتے —— کہیں تو یہ جان لیوا کھیل ختم ہو —— میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں، کہ اگر میں تمھیں بُری لگتی ہُوں اور تم مجھ سے دُور ہٹ جانا چاہتے ہو۔ تو پھر تم مجھ سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے، تاکہ میں خود تمھارا راستہ صاف کر دوں —— اگر تم سے —— میری باتیں —— میرا وجود —— میری سانسیں —— میری آواز میری مسکراہٹیں —— میرے آنسو، برداشت نہیں ہو سکتے۔ تو پھر میں کبھی تمھارے سامنے آ کر تمھیں تکلیف نہ دُوں گی —— تمھیں آزمائش میں نہ ڈالوں گی —— بس آنکھوں میں آنسو چھپائے چُپ چاپ ویران راہوں پر چل نکلوں گی —— کیوں کہ میں محبت میں مجبوری، اور زبردستی کی قائل نہیں —— اگر تمھارے دل میں خود کوئی جذبہ —— کوئی احساس، پیدا نہیں ہُوا —— تو اب اگر میں اپنی جان بھی دے دوں —— تب بھی —— تمھارے دل میں کوئی جذبہ —— کوئی احساس نہ جاگ سکے گا ——

لوگ اگر یہ کہتے ہیں —— کہ :

"محبت ہوتی نہیں —— کی جاتی ہے!"

تو یہ میرے نزدیک سراسر غلط ہے —— آپ کوشش کر کے کسی سے محبت نہیں کر سکتے —— یہ تو وہ جذبہ ہے، جو چپکے سے دبے پاؤں آکر دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے —— شبنم کے اُس قطرے کی مانند —— جو رات کے کسی سنسان لمحے میں پھولوں کے جگر میں اُترتا ہے —— اور ہمیشہ رہتا ہے —— یہ الگ بات ہے —— کہ وقت کے ساتھ ساتھ —— اس کی شدت میں کمی آجائے۔ لیکن یہ کبھی ختم نہیں ہوتا —— کبھی فنا نہیں ہوتا ——

اور محض یہ سوچ کر کہ —— "یہ جذبہ زبردستی کسی کے دل میں نہیں پیدا کیا جا سکتا" —— مَیں انھیں معاف کر دیتی ہُوں —— یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے، کہ وہ ہر کسی سے محبت کرنے لگے۔ مَیں تو اپنے دل سے مجبور ہوں —— اپنی لگن سے مجبور ہُوں —— کہ ان سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتی —— لیکن مَیں انھیں مجبُور بھی نہیں کر سکتی —— کہ وہ مجھے چاہیں —— مجھ سے محبت کریں! مگر مجھے ان سے ایک شکوہ، —— ایک شکایت ضرور ہے، کہ اگر وہ مجھے نہیں چاہتے تھے۔ مجھ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ تو پھر وہ مجھ سے یُوں اپنائیت سے ملتے کیوں رہے!! اُن کی آنکھوں نے مجھے اِس دھوکے میں کیوں رکھا —— اگر انھوں نے چلے ہی جانا تھا، تو پھر انھوں نے —— میرے دل میں اپنا خیال کیوں پیدا —— مجھ سے اتنا پیار کیوں بڑھایا —— اب مجھے سمجھ نہیں آتا، کہ جب

وہ بازوؤں کے حلقے میں لے کر گرمجوشی سے مجھے پیار کرتے تھے۔
اسے کیا کہوں —— کیا سمجھوں —— کیا وہ محض جسم کی کشش تھی!
کیا انھیں معلوم نہیں، کہ اتنی دُور جا کر اتنی بلندی پر چڑھنے کے
بعد واپس آنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

میں اس کے لیے انھیں کبھی معاف نہیں کروں گی —— کہ نہ
چاہنے —— نہ پیار کرنے کے باوجود —— انھوں نے محبت کا
ڈھونگ رچایا —— اور اب جب کہ میں اس ریشمی جال میں بُری
طرح اُلجھ کر رہ گئی ہوں —— وہ مجھ سے دُور چلے جانا چاہتے ہیں۔
میں اپنا سب کچھ لٹا کر بھی ناکام ہوں —— اور وہ اپنا سب کچھ
بچا کر بھی کامیاب ——

یہ بات بھی نہیں —— کہ مجھے احمر کے سوا —— دُنیا میں کوئی
مرد دکھائی نہیں دیتا —— دنیا خوبرو —— تعلیم یافتہ، اور دولت مند
مردوں سے بھری پڑی ہے —— یہ سب کچھ تو ہے —— لیکن احمر
کہاں ہیں —— دنیا میں میرا آئیڈیل —— میرا محبوب، صرف ایک ہی ہے
جو ان کے جسم میں پنہاں ہے۔ پھر کسی دل کے جواب میں میرا دل یُوں میٹھے
اور نشاط انگیز درد کے ساتھ نہیں دھڑکا —— پھر کوئی دوسری آنکھیں،
میرے لیے ان آنکھوں کی جگہ نہ لے سکیں جو مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں —— اور
یہ بات بھی نہیں، کہ میں کوئی بدصُورت لڑکی ہوں —— یا جاہل ہوں، یا مجھ میں
کسی کو متاثر کرنے والی کوئی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے، کہ مجھ میں لوگوں

کو متاثر کرنے والی تمام خصوصیات ہیں۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہی کہ میں خود پسند ہوں — بلکہ اس لیے کہہ رہی ہوں، کہ بارہا لوگوں نے میری آنکھوں — میرے بالوں — میرے ہاتھوں — میری سلیقہ شعاری — میری خوش لباسی — اور میری صلاحیتوں کی تعریف کی ہے لیکن یہ سب خوبیاں میرے کس کام کی، کہ یہ خوبیاں احمر کو متاثر نہ کر سکیں انھیں میرا نہ بنا سکیں — کاش — کوئی میرا سب کچھ لے لے، اور مجھے وہ احمر دے دے، جو میرا ہو، جو مجھے چاہتا ہو — مجھ سے محبت کرتا ہو — کیا یہ ممکن ہے ؟؟؟

○

یکم جولائی ۱۹۵۹ء

کھڑکی پر بارش کے قطرے لرز رہے تھے ــــ اور کانچ کی سطح پر ــــ روشنی کے سائے ــــ اُمید اور نااُمیدی کی طرح لرز رہے تھے۔

باہر رات تاریک تھی!

درخت کہر میں ڈوبے آسیب زدہ معلوم ہو رہے تھے، اور میری نظریں دُور درختوں کے جُھنڈ میں احمر کو مس نُور کے ساتھ اور کبھی مس انجم کے ساتھ، اٹھکیلیاں کرتے دیکھ رہی تھیں۔

میرے ذہن میں شگفتہ کے الفاظ گونج رہے تھے ــــ جو آج صبح اُس نے مجھ سے کہے تھے:

"تمھیں پتہ ہے ــــ کہ احمر مس نُور سے محبت کرتے ہیں! کل پارک کے ایک کُنج میں مَیں نے اُنھیں نُور کے ساتھ دیکھا۔ وہ بہت بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھامے کچھ کہہ رہے تھے!! میرا تو خیال ہے، بٹیا، وہ اُس سے شادی کر لیں گے۔"

وہ تو یہ باتیں سُنا کر چلی گئی ــــ اور مجھے ایک دہکتی ہُوئی

دوزخ میں ڈال گئی۔

اس سے پہلے بارہا مَیں نے بھی ——— مِس نُور سے ——— احمر کو ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تھا، — بلکہ ——— صرف اُنہی سے نہیں! — بلکہ ——— وہ تو انجم میں بھی اُسی طرح دلچسپی رکھتے تھے جیسے کہ مِس نُور میں!

اور اب اس وقت ——— ایک ہی سوال ——— میرے ذہن میں گردش کر رہا ہے:

وہ حقیقت میں کِسے چاہتے ہیں؟

نُور کو ———

انجم کو ———

یا ———

بینا کو ———

یا پھر!

کسی کو بھی نہیں ———

ہم لڑکیاں اُن کے لیے رنگین ——— خوبصورت ——— اور پُرکشش کھلونے ہیں ——— جن سے جب تک اُن کا دل چاہتا ہے ——— وہ کھیلتے ہیں ——— اور جب جی چاہتا ہے ——— وہ پھینک کر چل دیتے ہیں

اس وقت میرا دل غموں کے طوفان میں گِھرا ہُوا ہے۔ ایک عجیب سی جامد اور ساکت اداسی ہے۔ جس نے مجھے، میرے پُورے محسوسات کو اپنی گرفت میں

لے لیا ہے ــــ اور مَیں نہ ہنس سکتی ہُوں ــــ نہ بول سکتی ہُوں، اور نہ سوچ سکتی ہُوں ــــ مَیں اِس ہولناک گرداب میں پھنسی آپ ہی آپ گھُوم رہی ہُوں ــــ مجھے لگتا ہے، کہ یہ گرداب فنا مجھے موت کی گہرائیوں میں لے اُترے گا ــــ لیکن جب آگ لگی ہے، تو سب کچھ جل جانے دو ــــ راکھ ہو جانے دو! تاکہ کچھ بھی باقی نہ بچے ــــ خواب اور حقیقت کے درمیان تو زمین اور آسمان کی وسعتیں حائل ہیں۔ خواب جو عموماً دلکش، سہانے اور پُر اسرار ہوتے ہیں ــــ اُن کی تعبیر کِتنی تلخ ہوتی ہے ــــ اس زندگی کی طرح ــــ جو دُکھوں، غموں، کڑواہٹوں ــــ اور حادثات کا مجموعہ ہے۔ اس حقیقت سے تو مَیں آج باخبر ہو رہی ہُوں!

میرے چاروں طرف میری تمناؤں ــــ میری آرزوؤں کی ناکامی راکھ بن کر اُڑ رہی ہے ــــ اور اِس آندھی میں مجھے اپنی ماں کا چہرہ دکھائی دے رہا ہے ــــ جس کی آنکھیں آنسوؤں کے کھر میں ڈُوبی ہوئی ہیں ــــ وہ کپکپاتے ہونٹوں سے کہہ رہی ہیں ــــ تم نے یہ کیا کیا بیٹا، کیا تم اپنے پاپا کو بھُول گئیں ــــ اُن کی بے رحمی ــــ ان کی سفاکی کو فراموش کر بیٹھیں ــــ جس نے مجھ سے جینے کی اُمنگ چھین لی تھی ــــ جس نے مجھے موت کی برفیلی وادیوں میں لا پھینکا تھا، تم کیوں بھُول گئیں ــــ سب مرد ایک سے ہوتے ہیں ــــ بے رحم سفاک ــــ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنے والے۔

اسی طوفان میں مجھے نرگس کا چہرہ نظر آ رہا ہے —— وُہی نرگس جو اپنے محبُوب کی بے وفائی کے بعد سینی ٹوریم کے ایک کمرے میں لیٹی موت کا انتظار کر رہی تھی۔

میرے کانوں میں احمر کی باتیں گونج رہی ہیں —— جو وہ اپنے دوستوں سے کر رہے تھے!!

یہ مَیں کیا کر بیٹھی ہُوں —— کیسا روگ لگا بیٹھی ہُوں —— کیسا زہر پی رہی ہُوں —— مَیں کیا کروں —— کیا کروں ——

○

۲۰- جولائی ۱۹۵۹ء

وہ میرے قریب بیٹھے تھے —— میرا ہاتھ —— آج بھی ان کے ہاتھ میں تھا —— میرے رُخسار کو اُن کے سانس کی آنچ چھُو رہی تھی۔ وہ آج بھی اُتنے ہی دلکش تھے —— ان کی آنکھوں میں مسحور کر دینے والی کشش آج بھی تھی —— وہ دلکش —— اور لطیف خوشبو آج بھی ان کے جسم سے آ رہی تھی —— جو کبھی میرے احساسات پر نشہ بن کر چھا جایا کرتی تھی —— ان کی خوب صورتی —— آج بھی مکمل تھی!

لیکن احساس کے آلے —— اتنے کند ہو چکے تھے، —— کہ بیتے دنوں کا کوئی لمحہ —— جذبات میں ہل چل مچانے کے قابل نہ رہا —— ٹھنڈی ٹھنڈی برف —— میرے احساسات پر گرتی رہی ——

آج —— سر سے پاؤں تک —— بجلیاں نہیں کوندیں —— میرا دل نہ دھڑکا —— میری چاہت کے دہکتے ہوئے انگاروں پر ان کی سرد مہری کی جو دبیز راکھ پڑی تھی —— اُسے ہوا کا کوئی جھونکا

نہ اڑا سکا تھا۔

میرے جذبات کیسے شل ہو چکے تھے !!

مَیں اُن کی آغوش میں تھی ——

دو پنکھڑیاں —— میرے ہونٹوں —— میرے رخساروں —— میرے بالوں —— میری گردن سے مَس ہو رہی تھیں۔

لیکن وُہ اعلیٰ و ارفع —— قلب و جگر کو گرماتا ہُوا —— سانس روکنے والا شدید جذبہ —— خدا جانے —— آج کہاں غائب ہو گیا تھا۔

چاروں طرف برف تھی !

برف ہی برف ——

جس جذبے کو ہاتھ لگاؤ —— یخ بستہ ——

جس آرزو کو دیکھو —— برفیلی ——

جس شوق کو چھُوؤ —— خاکستر ——

حالانکہ مَیں وہی تھی —— سپردگی اور اعتماد بھی وہی تھا —— اُن کی دلفریبی اور دلکشی بھی مکمل تھی —— لیکن رگ رگ میں سنسنی پھیلانے والا خوبصورت جذبہ کہاں تھا ؟ —— کہاں تھا ؟ ؟

مَیں نے اُن سے کہنا چاہا :

خزاں کے زرد پتّے زیادہ دیر تک خزاؤں کی سرد ہواؤں کے ستم برداشت نہیں کر سکتے۔ مَیں تو پہلے ہی تمھاری جُدائی میں نڈھال ہو رہی ہُوں۔

اگر تم نے مزید تاخیر سے کام لیا ـــــ تو نہ جانے ہوائیں مجھے اڑا کر کہاں سے کہاں لے جائیں ـــــ پھر تم مجھے ـــــ کہاں ڈھونڈ پاؤ گے ـــ ؟

لیکن جب مَیں نے ارادہ کیا ـــ تو ان کے لب و رخسار ـــــ اُن کی آنکھیں ـــــ اُن کے ہونٹ ـــــ اُن کا سارا وجُود میری راہ روک کر کھڑا ہو گیا ـــــ خاموشی ـــــ ایک تیسرا وجُود بن کر ہمارے درمیان حائل رہی۔

مجھے یُوں لگا :

جیسے ہمارے درمیان جو فاصلہ ہے ـــــ اُسے اب پاٹنا، میرے بس میں نہیں رہا ـــــ نہ جانے ـــ وہ کون سی کمی تھی ـــــ جو مجھے اُن کی ـــ یا ـــ اُنھیں میری رُوح سے ہم آہنگ نہ ہونے دیتی تھی ـــــ ہم ایک دوسرے کے بُہت قریب ـــ بہت دُور بیٹھے رہے۔ وہ خاموشی سے باہر کے مناظر دیکھ رہے تھے، اور مَیں اپنے بے ثمر خیالات میں اُلجھی ہوئی تھی ـــ میرا ذہن پریشان تھا ـــ میری آنکھیں ویران تھیں ـــــ اور دل میں محرومی کا سیلاب اُمنڈتا چلا آرہا تھا، میرے ہاتھ برف کی مانند سرد ہو رہے تھے۔ مَیں اُن سے اپنا ہر غم، اپنا ہر دُکھ کہہ دینا چاہتی ہوں۔ لیکن فوراً ہی مجھے خیال آتا ہے، کہ جب وہ خود سے یہ سب نہ سمجھ سکے۔ نہ محسوس کر سکے ـــــ تو اب میرے کہہ دینے سے کیا ہو گا یہ تو ایسی باتیں ہیں ـــــ جو کہی نہیں جاتیں ـــــ محسوس کی جاتی ہیں۔

بن کہے سمجھ لی جاتی ہیں۔

اور وقت گزرتا گیا ——

وہی وقت جو کبھی — میرے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا پیام لے کر آتا تھا — وہی وقت — وہی لمحے — جو کبھی میرا حاصلِ حیات تھے — آج اپنے اندر بے کیفی اور شدید بیزاری کی کیفیت لیے ہوئے تھے، — دل کا بھاری بوجھ، ایک تلخ اور جلتے ہوئے ہیجان میں بدلتا چلا گیا۔ آہ — کتنے مہلک تھے، یہ ذہنی فاصلے، جنھوں نے میرے جسم کی لطافتیں —— خیالوں کی نزاکتیں —— تصوّرات کی رعنائیاں سب کچھ چھین لیا تھا۔

○

۶- اگست ۱۹۵۹ء

میرے ہر گیت کا شعلہ —— دھواں بن چکا ہے —— اور ہر نغمہ پھول بننے سے پیشتر ہی تاریک زمین میں دفن ہو چکا ہے۔ میں تیز بگولوں میں درخت کی شاخ سے ٹوٹے ہوئے —— پتّے کی طرح زمین پر بے بس پڑی ہُوں —— اور شام کو —— چلنے والی خزاں کی ہوائیں مجھے اپنے ساتھ ساتھ اُڑائے پھرتی ہیں —— میرے خوابوں کی دلکش وادیاں —— جہاں پہلے رنگ برنگ کے پھول اُگتے تھے —— اب وہاں زخم ہی زخم ہیں!

وہ پھُول کہاں کھو گئے —— ؟

وہ گیت کہاں جا کر سو گئے —— ؟

میں اپنی توہین اور ذلّت اب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی —— میں اُن کے لیے، موت کا کڑوا اور زہریلا ذائقہ تو گوارہ کر سکتی ہوں —— مگر یہ گوارہ نہیں کر سکتی —— کہ ان کی نگاہوں میں میری کوئی عزّت باقی نہ رہے —— میں ان کی بے رخی اب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔

عورت، مرد کی ہر خامی کو برداشت کر لیتی ہے — مگر یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہ کسی اور عورت کو اس سے زیادہ چاہتا ہے — اُس کی دنیا میں طوفان آجاتا ہے، اور وہ طوفان آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے لگتا ہے۔ لیکن میں نے کوشش کی تھی کہ میں اسے بھی برداشت کر لوُں — وہ میرے سامنے، مِس نوُر سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے مِس انجم میں دلچسپی لیتے تھے — اور بارہا — میں نے یہ سُن کر بھی — کہ وہ آج انجم کے ساتھ پکچر دیکھ رہے تھے، — مِس نوُر کے ساتھ پکنک منانے گئے تھے — اپنے دل پر جبر کیا — اور کوشش کی، کہ میں اُن کے سامنے اس کا اظہار نہ کروں — کہ میں یہ سب جانتی ہوُں — لیکن آخر کب تک — صبر کی بھی انتہا ہوتی ہے — ضبط کی بھی انتہا ہوتی ہے — اور اب — مجھے لگتا ہے، کہ یہ دکھ — یہ غم — یہ اذیّت میں زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکوں گی، ممکن ہے۔ میں اسے بھی سہہ جاتی — برداشت کر جاتی — اگر وہ مجھ سے ملتے رہتے — لیکن انھوں نے — وُہ تکلیف دہ روش مستقل اپنالی ہے۔ آج کئی مہینوں سے وہ مسلسل یہی کر رہے ہیں — کہ مجھے بلاتے ہیں — اور خود نہیں آتے — اور میں محبت میں — اتنی اندھی ہو چکی ہوُں — کہ ہر بار ناکام لوٹ جانے کے بعد بھی — اُن کے بلانے پر پھر دوبارہ — چلی جاتی ہوُں!

میرے دل کی سرزمین پر — بارہا آنسو گرے — چُپ چاپ گرتے رہے — آواز بھی ہوئی — بکھرے بھی اور ٹوٹے بھی گئے. مگر کوئی آہٹ وہ نہ سُن سکے — نہ محسوس کر سکے —

اپنے جذبات کی شدّت سے گھبرا کر مَیں نے انھیں خط لکھے — ملنے کی التجائیں کیں — فون کیے — مگر وہاں اک خاموشی تھی سب باتوں کے جواب میں — وُہ تو میری باتوں کو اِس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ان کا جواب ہی دے دیا جائے —

کل جب ہم وقتِ مقررہ پر اس جگہ پہنچے. جہاں احمر ملا کرتے تھے. کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد — جب وہ نہیں آئے — تو فراز نے مجھ سے کہا تھا :

" آخر آپ کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہی ہیں — احمر کے اس مایوس کن روّیے سے آپ سمجھ کیوں نہیں جاتیں — وہ کسی کو کوئی اہمیّت نہیں دیتے — ان کی زندگی میں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں! لڑکیاں ان کی زندگی میں داخل ہوتی ہیں — اور پھر — چلی بھی جاتی ہیں — اور وہ انھیں — اس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے جیسے کسی دل کش خواب سے آپ اچانک بیدار ہو جائیں — اور آپ پر کچھ دیر تک — بے زاری — اور بے کیفی کی کیفیت طاری رہے — اور — بس — "

مَیں خاموش رہی !

میں فراز کی باتوں کا کیا جواب دیتی —— گزشتہ چار برسوں میں وُہی ایک ایسا شخص تھا —جو— برف باری —— تپتی دوپہریں —— موسلا دھار— برسات میں بھی میرے انتظار میں شریک رہا تھا، اور بے زاری، تکلیف وہ مایوسی جو میرے حصّے میں آئی تھی۔ اس میں وہ بھی شریک رہا تھا —— میں تو اپنے دل سے مجبور تھی۔ لیکن —— اسے کیا مجبوری تھی —— وہ کیسا دوست تھا کہ اپنے دوست کی ذراسی خوشی کے لیے ان تمام صعوبتوں کو برداشت کرتا رہا تھا۔

○

یکم ستمبر ۱۹۵۹ء

آج —— پہلی بار میں نے سنجیدگی سے سوچا —— اور گزرے ہوئے چار سالوں کا —— کوئی ایک دن بھی ایسا —— تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف رہی ، —— جب احمر —— فراز کی غیر موجودگی میں مجھ سے ملے ہوں —— لیکن میری یادداشت میں —— کوئی ایک دن بھی ایسا نہ تھا !!

فراز ہی ہمارے درمیان ایک مضبوط کڑی بنا رہا تھا —— ممکن ہے —— کہ اگر فراز نہ ہوتا —— تو یہ خدشہ جو میں چار سال بعد محسوس کر رہی ہوں —— بہت پہلے مجھے اس کا احساس ہوجاتا۔ اور اب یہ سوچ کر مجھے اور بھی دکھ ہو رہا ہے —— کہ ایک فراز ہے جس سے میرا کوئی تعلق —— کوئی رشتہ نہیں —— لیکن وہ میرے ہر دکھ —— ہر غم میں شریک رہا —— مجھے جب بھی وقت دیا —— تو اُس وقت سے کہیں پہلے آ کر میرا انتظار کرتا رہا —— کہ مجھے مایوسی نہ ہو —— مجھے انتظار کی کوفت برداشت نہ کرنی پڑے —— اور ایک احمر تھے —— جن پہ میں اپنی جان تک نثار کرنے کو تیار تھی ،

اور جو اتنی سہولتیں میسّر آنے پر بھی ملنے سے گریز کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی میرا یُوں انتظار نہ کیا تھا ـــــ اور نہ ہی اُس کوفت، اُس اذیّت کو ـــــ محسوس کر سکے تھے ـــ جو مجھے ـــــ اُن کے نہ آنے پر ہوتی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے :

جب بھی ایسا ہوا ـــــ کہ احمر وقت دینے کے باوجود نہ آئے ـــــ تو فراز مجھ سے یُوں شرمسار رہا ـــــ جیسے یہ نازیبا حرکت اُسی سے ہوئی ہو ـــ جیسے ـــــ یہ دُکھ ـــــ یہ مایوسی ـــ جس سے مَیں گزر رہی ہُوں ـــــ اُسی نے مجھے عطا کی ہو ـــ تب ـــ وہ تمام راستے خاموش بیٹھا ـــــ ڈرائیو کرتا رہتا ـــــ وہ مُڑ کر میرے چہرے تک کو نہ دیکھتا، ـــ اور یہ بات مَیں آج محسوس کر رہی ہوں ـــــ کہ میرے چہرے پر ٹھکرائے جانے کا احساس جس طرح غالب آجاتا تھا ـــــ اور میری آنکھیں ـــــ جو آنسوؤں سے لبریز ہو جایا کرتی تھیں، ـــــ وُہ اِن کی تاب نہ لا سکتا تھا ـــــ وہ مجھے شکست خوردہ نہ دیکھ سکتا تھا ـــــ

پھر تمام راستے ـــــ

مَیں اپنے پریشان کن خیالات سے اُلجھتی رہتی !

اور ـــ وُہ ـــــ

اپنے ہی خیالات میں محو رہتا ـــــ

میں حیران ہوں — کہ وہ اتنی — صعوبتیں کیوں برداشت کرتا تھا آخر اُسے کیا حاصل ہوتا تھا —

اگر مَیں اخلاقی لحاظ سے فراز اور احمر کا موازنہ کرنے بیٹھوں، تو فراز — احمر سے کہیں زیادہ بلند ہے — اس نے جب بھی کوئی وعدہ کیا — تو مردوں کی طرح اس وعدے کو نبھایا — اس نے مجھے کسی مغالطے میں نہ رکھا — اس نے کوئی عہد شکنی نہ کی — برسات — تپتی دوپہریں — برف باری — اور لُو کے طوفان بھی — کبھی اس کی راہ میں حائل نہ ہوئے — اس نے جب کہا — مَیں آؤں گا — تو وہ آیا — اِن تمام مشکلات کے باوجود جو اُس کی راہ میں حائل ہوتیں۔

وہ اتنا خوبصورت — اتنا تعلیم یافتہ نہیں — جتنے احمر ہیں — وہ اتنا خوش لباس بھی نہیں — نہ ہی وہ سوسائٹی کے آداب سے اتنا واقف ہے — نہ ہی گفتگو کے فن میں اُسے عبور حاصل ہے — وہ سیدھی — سچّی — اور کھری — بات کرتا ہے — اور ایک مکمل انسان ہے — اُس نے میرے لیے — خوشیوں کے لمحات فراہم کیے — گو وہ بہت جلد معدُوم ہو گئے — لیکن — اس میں اس کا کوئی قصُور نہیں — اس نے تو اپنی طرف سے پُوری کوشش کی تھی — کہ یہ خوشیاں میرے لیے دائمی ہو جائیں — لیکن مقدر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟

مقدر ——

اس لفظ پر مجھے احمر کا کہا ہُوا — ایک جُملہ یاد آ رہا ہے —
وہ کہتے تھے :

"مقدر — مقدر کیا ہے ؟ اپنی تقدیر تو انسان خود بناتا ہے —
البتہ حالات کا قائل ہونا پڑتا ہے !"

کاش وہ مجھے بتاتے — کہ میرا کیا قصور تھا — جس کی سزا
مجھے مِل رہی ہے — مَیں نے تو ہمیشہ انھیں خوش رکھنے کی کوشش کی۔
ہمیشہ ان کے ساتھ کی — اُن کی رفاقت کی تمنا کی — تو آخر — پھر کیوں
مجھ سے میری خوشیاں چھن گئیں !!

۲۵- ستمبر ۱۹۵۹ء

پہلے پہل خوابوں کے آبگینے میں حرفِ بال آیا۔ اُن کے رویّے سے یہ آبگینہ ایک چھناکے سے ٹوٹا۔۔۔ اور کرچیاں بن کر میرے ذہن کو کاٹنے لگا۔ یہ کرچیاں زندگی کی وہ سفاک حقیقتیں تھیں، جنھوں نے مجھے طلسمات بھرے دُھندلکوں سے نکال دیا تھا۔۔۔۔ محبت کے لمحات پانی کے اُن بلبلوں کی مانند ہیں۔۔۔ جو ذرا سی دیر میں معدوم ہو جاتے ہیں۔۔۔ اس حقیقت سے تو مَیں اب باخبر ہوئی تھی۔

"احمر کی شادی۔۔۔۔ اس شہر کے سب سے بڑے رئیس امجد کی بیٹی سے ہو رہی ہے۔"

یہ خبر۔۔۔ میرے خرمنِ اُمید پر بجلی بن کر گری۔۔۔ جس سے میرے سارے منصوبے جل کر راکھ ہو گئے۔ مَیں اپنے آپ کو اُس ٹوٹی ہوئی کشتی سے مشابہ سمجھنے لگی۔ جس کے شکستہ ٹکڑوں کو طوفانِ حوادث نے اٹھا کر ساحل سے دور۔۔۔ بہت دور۔۔۔ پھینک دیا ہو۔۔۔ میرے سنہرے خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے۔۔۔ وہ برسوں کی جانی پہچانی تصویر آج کس طرح بیگانہ دکھائی دے رہی تھی۔ سب کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

سب کچھ بکھر گیا تھا۔ سب کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا، اور میں خود خالی ہاتھ — خالی دامن — مبہوت کھڑی — اپنے مقدر کے اُفق پر اُمید کی آخری کرنوں کو روپوش ہوتا دیکھتی رہی، اور میری زندگی اماوس کی طویل رات بن کر رہ گئی۔

پھر ان کی شادی ہو گئی — ہزاروں کا جہیز اور ناز و نعم میں پلی ہوئی لڑکی ان کے گھر آ گئی — ان کا گھر نئے نئے فرنیچر سے بھر گیا — اور احمر اپنی خوشیوں میں مگن ہو کر مجھے ایک بھولے بسرے خواب کی مانند بھلا بیٹھے —

اور میں — میں تو بے خودی میں بس یہی سوچے گئی:

کہ — میں نے احمر کو ہمیشہ کے لیے صرف اس لیے کھو دیا ہے کہ میں کسی دولت مند کی بیٹی نہ تھی — میں ہزاروں کا جہیز نہ لا سکتی تھی — میں صرف انھیں اپنی محبت دے سکتی تھی — لیکن خالی خولی محبت کو کون دیکھتا ہے — محبت ذہن کو آسودگی تو بخش سکتی ہے — لیکن جسم کو آسائش نہیں — ان کی زندگی میں پہلے بھی کئی لڑکیاں آئیں — اور بعد میں بھی آتی رہیں گی —

لیکن ایسی لڑکی —

جو اپنے ساتھ ہزاروں کا جہیز لے کر آتی — شاید ایسا موقع زندگی میں پھر کبھی نہ آتا — لڑکیاں تو بہت مل سکتی ہیں — لیکن دولت بار بار نہیں ملا کرتی — کچھ ایسا ہی انھوں نے سوچا ہو گا، اور میں کتنی بے وقوف — کتنی ناسمجھ تھی — لوگ ذہنی آسودگی سے زیادہ جسمانی آسائش کو اہمیت دیتے ہیں — ہائے — اب تک میں یہ کیوں نہ سمجھ پائی تھی۔

یہ سوچتے ہوئے مَیں اپنے اُمنڈتے ہوئے آنسو — سینے میں اُتار لیتی جو گھُونٹ گھُونٹ کر انگارے بنتے رہے — اور میری خرمنِ ہستی کو پھونکنے لگے میری ساری زندگی جو پہلے ہی دُکھی دل کی پکار تھی — ایک طویل اور گھُٹی ہوئی آہ بن کر رہ گئی — جو لبوں سے پھُوٹتی نہیں — صِرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ میری ساری زندگی ایک اُجاڑ اور چٹیل میدان کی طرح ہو گئی — جہاں نہ چاند چمکتا تھا — نہ طلوعِ آفتاب کی جھلکیاں تھیں — نہ شفق کی رنگینیاں تھیں — اور مَیں خود — صحرا میں جھُلسے ہُوئے درخت کی مانند کھڑی تھی — اداس — تنہا — اکیلی — !

۱۰- اکتوبر ۱۹۵۹ء

آنکھیں روتی ہیں تو سب دیکھتے ہیں —— دل روتا ہے، تو کسی کو محسوس تک نہیں ہوتا۔ لیکن دل کا رونا کتنا ہولناک ہوتا ہے —— یہ کوئی مجھ سے پوچھے!!

میری اُمیدوں —— میری آرزوؤں کا حسین تاج محل گر کر مسمار ہو چکا تھا۔ جس میں میری ہنستی مسکراتی زندگی دفن ہو گئی تھی —— میری کھیلتی، مچلتی پُرشباب زندگی پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہر چھا گیا تھا —— ہر طرف تاریکی تھی —— جدھر نگاہ اٹھاؤ —— اندھیرا تھا —— گھُپ اندھیرا —— کہیں سے روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی —— اور اس تاریکی کے گھنے جنگل میں —— مَیں تنہا کھڑی —— اُس محبت اُس خلوص —— اُس جذبے کو پکار رہی تھی —— جو مجھ سے کھو گیا تھا۔ لیکن کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی —— کوئی آہٹ سنائی نہیں دیتی، کوئی جذبہ پلٹ کر مجھے نہیں پکارتا۔

خوشی کی ہر قندیل بجھ چکی ہے، اور بادلوں کی لپیٹ میں آکر میری ہر خوشی کُہرا گئی ہے۔

جب ذہن شعلوں کا آتشکدہ بن جائے۔ آنکھوں میں آرزوؤں کے تمام دیئے گُل ہو جائیں۔ چہرے پر راکھ اڑنے لگے — تب انسان کیا کرے؟ شکست کے بعد ہر انسان تخیل کی پناہ گاہوں کی طرف بھاگنے لگتا ہے، جب زندگی کی حقیقتیں سانپ بن کر ڈسنے لگیں۔ تو وہ خواب و خیال کو ہی اپنا سہارا بنا لیتا ہے۔ —— لیکن میں کیا کروں —— میرے خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے ہیں۔ میرے پاس کوئی جذبہ — کوئی خیال — کوئی خواب ایسا نہیں —— جس کے سہارے میں جینے کی تمنا کروں — اور جب خیال مر جاتے ہیں۔ تمام احساسات سو جاتے ہیں سوچوں کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں تو انسان گھبرا کر موت کو آوازیں دینے لگتا ہے۔ تب زندہ رہنا کس قدر مشکل لگتا ہے، اور اب میرا بھی جی چاہنے لگا ہے کہ چپکے سے موت کو اپنے گلے لگا لوں — اور ہمیشہ کی نیند سو جاؤں — پھر کوئی جذبہ — کوئی خیال — کوئی خوشی — کوئی غم مجھ پر اثر نہ کرے گا — دُور اونچے پہاڑ پر میری قبر ہو — جس پر جنگلی بادام کے گلابی پھول سایہ کرتے رہیں — اور اگر کبھی کوئی بھولا بھٹکا مسافر اُس طرف آنکلے۔ تو ایک لمحے کے لیے رُکے — اور پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑے — میرے لیے آنسو بہانے والا کوئی نہیں — آنسو تو اپنے بہاتے ہیں — اور میرا کوئی اپنا نہیں کوئی بھی اپنا نہیں —— ہر انسان کو محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ محبت کے بغیر اس کی رُوح کا سر چشمہ خشک ہو جاتا ہے، اور جسم راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتی — یہ دُکھ — یہ اذیت — یہ شکست جس نے مجھ سے میرے جینے کا حوصلہ بھی چھین لیا ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔

آخر خدا نے میرے مقدر میں محرومیاں ہی محرومیاں کیوں لکھ دی ہیں۔ میں جسے چاہتی ہوں۔ خدا اُسے مجھ سے چھین لیتا ہے۔ اس نے ممی کو چھین لیا۔ اور احمر کو بھی ــــ ممی مر کر مجھ سے ہمیشہ کے لیے الگ ہوگئیں ــ اور احمر ــ زندہ رہ کر بھی ــ میرے نہ ہُوئے ــــ

اور اگر یہ محرومیاں میرا مقدر بن ہی گئی تھیں ــ تو خدا مجھ سے میرا ذہن چھین لے۔ تاکہ مجھے کچھ یاد نہ رہے ــ احمر ــ احمر کی یاد ــ ان کا خیال ــ ان کے ساتھ گزارے ہوئے وہ لمحات، جو اب مجھے زندگی سے بے زار کیے دیتے ہیں ــ وہ مسرّتیں ــ وہ خوشیاں، جو اب مجھے کبھی نہ ملیں گی ــ آخر میں بھلا کیوں نہیں دیتی یہ سب کچھ ــ یہ نازک خیالیاں میرے حصّے میں کیوں آئیں یہ نازک احساسات مجھے کیوں ملے ــــ؟ آخر خدا نے مجھے اتنی مضمحل اور بے چین روح کیوں بخشی ــ؟

○

۲۵- اکتوبر ۱۹۵۹ء

میں نے سوچا تھا ـــــ کہ میں انھیں اپنے پیار سے جیت لوں گی، انھیں اپنا بنا لوں گی ـــــ لیکن میں کیا جانتی تھی ـــــ کہ اس دُنیا میں پیار سے زیادہ کشش ـــــ سنہرے ـــــ چمکیلے سکّوں میں ہے ـــــ میں ہار گئی، میرا پیار ـــــ میرا خلوص ـــــ میری محبت ہار گئی ـــــ اور اب میرے پاس کچھ نہیں ـــــ کچھ بھی نہیں ـــــ کن طوفانی ہواؤں میں تحلیل ہو گئے۔ خوشی اور مسرّت کے وہ بھرپور لمحے ـــــ کہاں کھو گئے ـــــ

اس سے تو بہتر تھا ـــــ کہ وہ مجھے ملے ہی نہ ہوتے ـــــ میں جانتی نہ ہوتی ـــــ کہ محبت کیسی ہوتی ہے ـــــ کیسی خوشیاں دیتی ہے۔ اس کے دامن میں کیسی انمول مسرّتیں پنہاں ہوتی ہیں ـــــ کسی کے لبوں سے نکلا ہُوا ایک بول ـــــ تمام کائنات سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ کسی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ـــــ دنیا کی تمام خوبصورت چیزوں سے زیادہ حسین ہوتی ہے ـــــ اور کسی کے ہاتھوں کا لمس ـــــ ہمارے جسم میں کیسے انوکھے ـــــ کیسے انجانے ـــــ کیسے لطیف جذبے ـــــ جگا دیتا ہے ـــــ وہ جذبہ ـــــ جو ہماری ذات میں پنہاں ہوتا ہے اور

جسے ہم خود نہیں جانتے۔

لیکن —— اب وہ سب کچھ کھو گیا ہے —— میں اُنھیں کہاں تلاش کروں —— محرومی کا جان لیوا احساس جاگ رہا ہے —— ہر داغ چمک اٹھا ہے —— دل کے گھاؤ —— جوالا مکھی بن کر کھول رہے ہیں —— اور یہ آگ مجھے جلائے دے رہی ہے —— حالات کی تلخیوں نے مجھ سے میرے سنہرے آنچل چھین لیے ہیں۔ میری رُوح پر غم کا تاریک سایہ چھا گیا ہے، میرے ہونٹوں پر غم کی اداسی جم کر رہ گئی ہے۔ میری آنکھوں میں شام کے گہرے سائے تحلیل ہو رہے ہیں۔ میری زندگی خزاں رسیدہ بھورے پتّے کی طرح سنولا گئی ہے، محبت کے بغیر —— زندگی کی ہر خوشی —— زندگی کا ہر رنگ بے چارگی میں ڈوبا ہُوا ہے —— میرے ہونٹوں پر زندگی کی ہر شکایت —— ہر گلہ خاموش ہو چکا ہے —— کوئی آواز نہیں —— کوئی شعلہ نہیں —— محض سسکیاں ہیں —— اور میں اپنی زندگی کے مزار پر چپکے چپکے رسے سے آنسو بہا رہی ہُوں!

حسین چاند اب بھی حسبِ معمول اپنی ٹھنڈی اور دلوں کو سکون بخشنے والی روشنی بکھیرتا ہُوا —— افق کی وادی سے نکلتا ہے —— کلیاں اب بھی چٹکتی ہیں —— لیکن میری امیدوں کا گلشن افسردہ ہے۔ میری دُنیا میں —— کوئی چاند نہیں چمکتا —— کوئی روشنی نہیں ہوتی، کہیں سکون نہیں ملتا —— میرے ارد گرد مہیب سنّاٹا ہے ——

ہر طرف گھمبیر اندھیرا ہے ـــــ اور اپنے اندر سمو لینے والی گہری تاریکی ہے ـــــ سانس روک دینے والی تاریکی اور اس تاریکی میں میرا دم گھٹ رہا ہے ـــــ سانس رُک رہا ہے ـــــ اور میرے ہاتھ برف کی مانند سرد ہو رہے ہیں ـــــ مجھے لگتا ہے ـــــ یہ تاریکی ـــــ یہ اندھیرا مجھے نِگل لے گا ـــــ مَیں خوفزدہ ہُوں ـــــ مَیں ڈر رہی ہوں ـــــ کاش کوئی ایسا ہوتا ـــــ جس سے مَیں اپنے یہ دُکھ ـــ یہ غم، کہہ ڈالتی ـــــ کاش کوئی آغوش میرے لیے وا ہوتی ـــ کاش ـــــ کوئی میرے دل میں ـــــ دکھوں، اور ناکام آرزوؤں کے سُلگتے انگاروں کی تپش محسوس کر سکتا ـــــ کاش کوئی میرے درد کا مداوا بن سکتا ـــــ

کاش ـــــ تم میرے ہوتے احمر ـــــ تو مَیں تمھارے سینے پہ اپنا سر رکھ کے، ان تمام داغوں ـــــ ان تمام دُکھوں ـــــ کو اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالتی ـــــ مَیں تمھیں اپنی اداس زندگی کا غمگین گیت سناتی ـــــ اور یُوں میری روح کا یہ بوجھ ہلکا ہو جاتا ـــــ لیکن تم کہاں ہو ـــ ؟ ـــ کہاں ہو ـــ ؟ ـــ میرے محبوب ـــ میرے ندیم ـــ میرے ہمسفر ـــــ

○

جب تم نے خود ہی اپنی شاخِ حیات پر کھِلنے والے پھُول سے منھ موڑ لیا، احمر —— تو اب مَیں کس سے گلہ کروں —— جب باغبان اپنے جذبات کی شدّت میں اپنے پھُول کو خود ہی اپنے پیروں سے روندتا چلا گیا —— تو اب شکوہ کس سے کروں —— جب تم ہی محبت میں پنپنے والی بیل پر انگارے برسانے لگ گئے۔ تب بھلا جھلسی ہُوئی بیل پر پھُول کھِل سکتے تھے کیا

کاش تم نے سوچا ہوتا —— احمر —— تمھارے پیار کی محرومی میرے لیے کتنی حشر خیز ہو گئی —— اور تمھاری یاد کی کسک —— کتنی جان لیوا —— اس ناقابلِ برداشت اذیّت سے گھبرا کر مَیں دعا کرتی ہوں —— کہ خدا میرے دل سے اس وارفتگی کو کم کر دے، اور مَیں تمھاری طرح تم سے —— تمھاری یاد سے —— دامن جھٹک ڈالوں۔

میرے سینے کے داغ گہرے زخموں میں بدل گئے ہیں —— جن سے ہر لمحہ ٹیسیں اُٹھتی ہیں۔ یادیں مجھے اُداس کر دیتی ہیں۔ کتنی اذیّت ناک ہیں یہ یادیں —— مَیں کیا جانتی تھی —— کہ وہ چند لمحوں کی مسرّت مجھے ہمیشہ کے لیے

یہ دُکھ —— یہ خلش —— بخش دے گی —— میری آنکھوں کے پیمانے چھلک اُٹھتے ہیں —— اور مَیں سوچتی ہُوں —— کہ کیا مجھے دینے کے لیے تمہارے پاس فقط آنسو ہی تھے —— جو تم نے مجھے عطا کر دیئے ——

تم نے آج تک مجھے صرف آنسو ہی تو دیئے ہیں —— یہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں —— یہ آنسو میرے شکستہ جذبات کے ترجمان ہیں —— جو دہکتے انگاروں کی صُورت میں بھسم ہو کر گرتے رہے —— اور مَیں اِنھیں ترتیب وار ایک لڑی میں پروتی گئی —— اس میں تمہارے ظلم —— تمہاری بے وفائی —— تمہاری سرد مہری، سبھی قسم کے انگارے ہیں ——

اور یہ مالا —— ایک روز مَیں تمہارے گلے میں —— ضرور پہناؤں گی!!

خنک راتوں میں —— جب پچھلے پہر —— عالم پر خاموشی طاری ہوتی ہے —— اور سارا عالم —— آرام کی نیند سو رہا ہوتا ہے —— تو مَیں اپنے بستر پر —— کروٹیں بدلتی رہتی ہُوں —— مجھے اپنی ہاری ہوئی بازی کا خیال آتا ہے —— اور اپنی شکست کا احساس کانٹوں کی طرح میرے جسم میں پیوست ہونے لگتا ہے —— مجھے کسی کروٹ چین نہیں آتا —— نیند نہیں آتی —— سکُون نہیں مِلتا —— تمہاری دی ہوئی اس خلش نے میری خوشیوں کا

ایک ایک لمحہ چھین لیا ہے ـــــ میری زندگی میں ـــــ مسرّت کے
لمحات تو پہلے ہی بہت کم تھے ـــــ تم نے رہے سہے بھی چھین لیے
ـــــ میری زندگی میں ـــــ محرومیاں پہلے کیا کم تھیں ـــــ کہ تم
نے اور بخش دیں ـــــ

اور مجھے !
یہ تڑپ ـــــ
یہ خلش ـــــ
یہ کسک ـــــ بخش کر تم خود کتنے مسرور و شاداں ہو ـــــ
میری آنکھوں میں پت جھڑ کا موسم آ بسا ہے۔
اور تمہارے ہونٹوں پر ـــــ بہاروں کے شگوفے آج
بھی کھلتے ہیں ـــــ
میری باتوں میں جدائی کی تڑپ ہے ـــــ
اور تمہارے ـــــ لہجے میں ـــــ فتح کی خوشی ـــــ
ہمکتی ہے ـــــ
مَیں ـــــ اپنے پورے ماحول سے گریزاں اور بیزار ہُوں،
کائنات کی ہر چیز سے شاکی ہُوں ـــــ
اور تم ـــــ زندگی کے ـــــ مسکراتے ہوئے پھُولوں
سے اپنا دامن بھر رہے ہو ـــــ
میری آنکھوں میں آنسو ہیں ـــــ

اور تمھارے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ——

یہ کیسا انصاف ہے قدرت کا —— ؟

آخر مجھے کس جُرم کی پاداش میں یہ سزا ملی ہے —— میرا قصوُر کیا تھا —— زندگی کی تمام رعنائیاں —— تمام بہاریں، مجھ سے کیوں رُوٹھ گئی ہیں —— مَیں آج بھی محروم کیوں ہوں —— اور تم شاد کام کیوں ہو ؟

○

۱۰۔ نومبر ۱۹۵۹ء

وہی اسٹیشن ہے۔ وہی لوگ ہیں ــــ وہ جگہ ہے۔ مگر مجھے یُوں لگتا ہے ــــ جیسے مَیں کسی اجنبی دیس میں آگئی ہُوں ــــ مجھے کوئی بھی اپنا نظر نہیں آتا ــــ میرا دل کام میں نہیں لگتا۔ میرا جی کسی سے بات کرنے تک کو نہیں چاہتا۔

سیڑھیاں اُترتے یا چڑھتے وقت یا شیشے کی دیواروں میں سے اگر کبھی احمر کی جھلک نظر آجائے۔ تب تو مَیں ہر شے سے بے زار ہو جاتی ہُوں ــــ میرے دل ودماغ میں شکست کی آگ پُوری شدت کے ساتھ بھڑک اُٹھتی ہے۔ میرے ذہن میں شعلے رقص کرنے لگتے ہیں۔ وہ جو میرے تھے ــــ اب میرے نہیں ــــ یہ احساس میری رگ رگ میں زہر بن کر گردش کرنے لگتا ہے۔ میری سوچنے سمجھنے کی تمام قوّتیں سلب ہو کر رہ جاتی ہیں ــ اور بعد میں، مَیں اپنی اس جنونی کیفیّت سے ہراساں رہتی ہوں ــ مجھے خوف ہے، کہ کہیں میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔ اُس لمحے تو میرے اپنے اعضاء میرے قابو میں نہیں رہتے۔

میرے زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لیے احمر آج بھی یہیں ہیں۔

وہ کہیں چلے جائیں — میری نظروں سے دور ہو جائیں — تو شاید میرے جذبات کی شدت میں کچھ کمی آجائے — شاید مجھے صبر آجائے — یُوں انھیں اپنے سامنے دیکھ کر، میرے زخم ہر روز ہرے ہو جاتے ہیں — ٹیسیں مجھے تڑپا دیتی ہیں — پھر مجھے کیا کچھ یاد نہیں آتا — اُف کس قدر اذیّت ناک ہیں یہ یادیں — وہ چاندنی راتیں — جب وہ میرے قریب ہوتے تھے — وہ برسات کی رم جھم، جب ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اور دھنکی ہوئی رُوئی کی مانند پاکیزہ اور اَن چھوئی برف — جب پہلی بار زمین بوس ہوتی تھی — تو اُن کی آغوش میرے لیے وا ہوتی تھی — ان کے جسم کی خوشبو — اُن کے سانسوں کی مہک — اس لمحے سب کچھ میرا ہوتا تھا۔ لیکن آج — آج وہ میرے نہیں — وہ ہونٹ میرے نہیں — وہ مہک میری نہیں — وہ آسودگی میری نہیں — سب کچھ چھن گیا ہے — سب کچھ رُوٹھ گیا ہے — کچھ بھی تو باقی نہیں رہا —

انھیں دیکھ کر اپنی اس محرومی کا جان لیوا احساس پُوری شدّت سے جاگ اُٹھتا ہے — ہر جذبہ ضدی بچّے کی طرح مچل اُٹھتا ہے —

مَیں اس جگہ سے — اس شہر سے — ان لوگوں سے دُور چلی جانا چاہتی ہوں — اتنی دُور — جہاں ان کا خیال، ان کی یاد تک نہ آسکے — پھر شاید مَیں زندگی سے سمجھوتہ کر لوں، کہ زندگی نام ہی محرومیوں کا ہے — زندگی نام ہی مر مر کے جیے جانے کا ہے — اور یہ دُکھ — یہ غم صرف میرے حصّے میں ہی نہیں، بلکہ اور بہت سے لوگوں کے حصّے میں بھی آئے ہیں۔

لیکن میں کہاں جاؤں ـــ اِس بھری دُنیا میں ایک جوان عورت تنہا کِس کِس کا مقابلہ کر سکتی ہے ـــ یہاں تو" ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مصداق مجھے بیگم اختر کا سہارا ہے ـــ میں ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ اس لیے کسی حد تک محفوظ ہوں ـــ کہیں اور چلی گئی ـــ تو کہاں رہوں گی۔ کِس کے ساتھ رہوں گی ـــ کوئی بھی تو نہیں ایسا ـــ اور مجھ میں دُنیا کی انگشت نمائی کی تردید کرنے کا حوصلہ بھی تو نہیں رہا ـــ

کاش ـــ احمر کہیں چلے جائیں ـــ تاکہ میں انھیں دیکھ نہ سکوں ـــ ان کا خیال ـــ ان کی یاد ـــ مجھے پریشان نہ کر سکے !!

○

۲۲ - دسمبر ۱۹۵۹ء

مَیں نے ایک ماہ کی رخصت لے لی ہے — مَیں برداشت نہیں کر سکتی احمر میرے سامنے رہیں — میرے قریب رہیں — اور مجھ سے اجنبی بنے رہیں، ہر چند کہ مَیں نے ہر ممکن کوشش کی، کہ میرا اُن کا آمنا سامنا نہ ہو — لیکن تابکے — مَیں بھی وہیں کام کرتی ہوُں — اور وہ بھی وہیں — ہمارے کام کرنے کے اوقات بھی وہی ہیں — پھر کیسے ممکن ہے کہ مَیں انھیں نہ دیکھوں — ابھی کل ہی کی بات ہے۔ مَیں اسکرپٹ ہاتھ میں لیے تیزی سے سٹوڈیو کی جانب بڑھی کہ پروگرام میں صرف ایک منٹ ہی تو باقی تھا — جوُں ہی مَیں نے دروازہ کھولا، — تو احمر سے ٹکراتے بچی — وہ اپنا پروگرام ختم کر کے باہر نکل رہے تھے۔ میری ساڑھی کا آنچل پھسل کر اُن کے شانے سے چھوُ گیا — مَیں لرز کر ایک طرف ہو گئی — اِس لمحے وُہ میرے کتنے قریب تھے — دو قدم کا فاصلہ بھی تو نہ تھا — اس احساس سے میرے رُخسار اب بھی دہک رہے ہیں — پھر وہ شرمسار سے آگے بڑھے — اور باہر نکل گئے — لیکن پھر مجھ سے کام نہ ہو سکا میری آواز — میرے تاثرات قابو میں نہ رہے — جب مَیں فارغ ہو کر باہر نکلی — تو شہاب کہنے لگے :

"مس بینا — آج آپ کی آواز میں وہ ٹھہراؤ نہ تھا۔"

میں نے جلدی سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا۔

صُبح شگفتہ ملی — تو کہنے لگی :

"رات تمھاری آواز کو کیا ہُوا تھا —— کس قدر لرز رہی تھی —— کیا ڈر لگ رہا تھا کسی سے!!"

اب میں اسے کیا بتاتی کہ میں جبر — اور ضبط کے کِن دُشوار گزار مرحلوں سے گزر رہی تھی — شاید پُل صراط سے گزرنا بھی اس سے مشکل نہ ہوگا۔

میرے ذہن سے ایک لمحے کو بھی ان کا خیال محو نہیں ہوتا۔ میں بات کسی سے کرتی ہوں — لیکن دھیان ان کی طرف رہتا ہے۔ میرے ہاتھ کام میں مصروف ہوتے ہیں۔ لیکن ذہن ان سے متعلق سوچ رہا ہوتا ہے۔ کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں — تو کتاب کے صفحوں پر اُن کی تصویر اُبھر آتی ہے، اور میں اُس میں اُلجھ کر پڑھنا بھُول جاتی ہُوں — میری سمجھ میں نہیں آتا —— میں کیسے اُن کے خیال سے چھُٹکارا پاؤں —— کیونکہ یہ یادیں مجھے کوئی آسُودگی — کوئی تسکین — کوئی سہارا نہیں دیتیں — یہ تو میرے زخموں کے مُنھ کھول دیتی ہیں۔ جن سے پھر لہُو ٹپکنے لگتا ہے —— بیگم اختر نے کل مجھے کمرے میں بے وقت لیٹے دیکھا — تو پُوچھنے لگیں :

"بینا —— آج گئیں نہیں" ——

جب میں نے بتایا —"کہ ایک ماہ کی رخصت لی ہے" ——

تو حیران ہو کر پُوچھنے لگیں :

"کیوں — خیریت تو ہے — کہیں جانا ہے کیا ؟"

"نہیں جاؤں گی کہاں — کام کرتے کرتے بور ہو گئی تھی —— سوچا کچھ چینجز کر لوں" —— اداس ہو کر میں نے کہا۔

بیگم اختر مطمئن تو نہ ہوئی تھیں — لیکن مجھے افسردہ دیکھ کر انھوں نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی — وہ چلی گئیں ، تو میں سوچنے لگی ، کہ کچھ دنوں کے لیے راحیلہ کے پاس چلی جاؤں ۔ لیکن پھر خیال آیا — آج کل اس کے فائنل امتحان ہو رہے ہوں گے — وہ پڑھائی میں مصروف ہو گی — ایسی صورت میں اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں — اس کے مستقبل کا سوال ہے ۔ اپنی ذرا سی خوشی کے لیے اس کا مستقبل تباہ کروں — یہ مجھے گوارا نہ تھا ——

۳۰ - دسمبر ۱۹۵۹ء

آج عید ہے ـــــ ساری دنیا مسرور و شادماں ہے ـــــ اور مَیں اپنے دُکھوں ـــــ اپنے غموں کو سینے سے لگائے ـــــ اپنے کمرے میں گھُسی بیٹھی ہوں ـــــ ہوسٹل کی لڑکیاں ـــــ ہاتھوں میں مہندی رچائے ـــــ رنگین ریشمی کپڑے پہنے ـــــ خوشبوؤں میں بسی ـــــ ایک دوسری کے ساتھ چہلیں کرتی پھر رہی ہیں ـــــ ان کے قہقہوں سے فضا گونج رہی ہے ـــــ

اور مَیں ـــــ اپنی آہیں ـــــ اور سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہی ہوں ـــــ میرے بال بکھرے ہیں ـــــ لباس ملگجا ہو رہا ہے، ہاتھ سُونے ہیں ـــــ مَیں نے مہندی نہیں لگائی ـــــ مَیں نے لباس نہیں بدلا ـــــ مَیں نے سنگھار نہیں کیا ـــــ

مَیں تو اُن لمحوں کو یاد کر رہی ہوں ـــــ جو اُن کے قرب میں گزارے تھے ـــــ

ابھی پچھلے سال کی تو بات ہے ـــــ پچھلی عید پر ـــــ مَیں اُن سے ملی تھی ـــــ وہ میرے تھے ـــــ میرے اور اُن کے درمیان

کوئی فاصلہ نہ تھا — ہمارے درمیان کوئی حائل نہ تھا —
لیکن آج —
ہمارے درمیان چاندی کی دیوار حائل تھی — جسے گرانا —
میرے بس کی بات نہ تھی —
آج ہمارے درمیان —
ایک سال — بارہ مہینے — کا فاصلہ تھا —
اور یہ وقت جو گزر چکا تھا — اسے واپس — نہ مَیں
لا سکتی تھی — اور نہ احمر —
ہمارے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی تھی — اُسے عبور کرنا
میرے اختیار میں نہ رہا تھا —
مَیں اب اُن سے نہ مل سکتی تھی — پھر مَیں — کس کے لیے
سنگھار کروں — کس کے لیے — ہاتھوں میں مہندی رچاؤں —
مجھے دیکھنے والا اب کہاں تھا !!
رہ رہ کر میرے کانوں میں — احمر کا کہا ہُوا — ایک جُملہ
گونج رہا ہے —
وہ کہا کرتے تھے :
کسی سے توقعات وابستہ نہ کرو — کسی سے اُمید نہ رکھو —
کہ وہ تمہارے کام آئے گا — کیوں کہ توقعات کی شکست بڑی
دل شکن ہوتی ہے — امیدیں جب ٹوٹتی ہیں — تو کچھ باقی

نہیں رہتا — اس لیے بہتر ہے — کہ اپنے آپ کو پہلے ہی سے ہر حادثے کے لیے تیار رکھو —

کتنا صحیح کہا تھا انھوں نے — واقعی توقعات کی شکست بڑی ہی دل شکن ہوتی ہے — یہ میں اب جان پائی ہوں — تم تو مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں سمجھاتے رہے تھے اگر — یہ تو میری نادانی تھی — میری ناسمجھی تھی — کہ میں کچھ نہ سمجھ سکی تھی — کچھ نہ جان سکی تھی — تم نے مجھ سے کبھی — زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ نہ کیا تھا، کبھی یہ نہ کہا تھا :

کہ — تم تمام عمر میرا ساتھ دو گے — ہمیشہ مجھ سے ملتے رہو گے۔ تم نے تو وفا کا — پیار کا — محبت کا — یقین تو مجھے دلایا ہی نہ تھا — پھر اب تم سے کیسے کہوں — کہ تم نے — بے وفائی کی — میں تو نادان تھی — میں نے سوچا — تمھاری آنکھیں کچھ کہتی ہیں — تمھارا دل جو اتنے پیار سے دھڑکتا ہے۔ تمھاری باہیں، جو اس چاہت سے مجھے اپنے حلقے میں لے لیتی ہیں یہ سب سچ ہے — ان سب کے آگے لفظوں کی بھلا کیا حقیقت ہے — اُن کے آگے تو — سب کچھ ہیچ تھا — پھر بھلا چند الفاظ کیا معنی رکھتے ہیں۔

لیکن — میں کیا جانتی تھی — کہ زبان سے نہ کہہ کر — تم اپنے آپ کو صاف بچالے جانا چاہتے تھے — تم نے کوئی وعدہ نہ

گیا تھا ــــ کوئی قسم نہ کھائی تھی ــــ کوئی عہد نہ کیا تھا ــــ اب تمہیں بھلا کون الزام دے سکتا ہے ــــ

لیکن ــــ میرا دل آج بھی نہیں مانتا ــــ تم جو اتنے مہربان، اتنے عظیم ــــ اتنے نرم دل ــــ اتنے اپنے تھے ــــ تم نے خود یہ سب کچھ کیا ہے ــــ تم مجھے کن تپتے صحراؤں میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ گئے احمر ــــ تم نے یہ کیا کیا ــــ

کیا کیا میرے محبوب ــــ

○

۲۵- ستمبر ۱۹۶۰ء

وقت گزرتا رہا — وہ پہلے کبھی کب تھما تھا — جواب تھم جاتا — وہ تو ایک ہی رفتار سے گزرتا رہتا ہے — یہ تو ہمارے اپنے احساسات ہوتے ہیں، جو کبھی اُسے تھما محسوس کرتے ہیں — کبھی سُست رفتار — اور کبھی تیز رفتار — اسے اتنی فرصت کہاں جو کسی کے آنسو پونچھ سکے اس میں کسی کے درد و غم سمجھنے کے جذبات نہیں ہوتے — وہ کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ اُس بے رحم منصف کی طرح جو اپنے خزانے سے ہر ایک کے حصّے کی خوشی اور غم اُس کی جھولی میں ڈالتا ہُوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ کس میں طاقت ہے کہ اسے پکڑ سکے — اسے روک سکے!

وقت تبدیلی کا بہت بڑا دھارا ہے — وقت زندگی دیتا ہے، تو موت بھی — وقت زخم دیتا ہے، تو انہیں مندمل بھی کر دیتا ہے، اور مجھے بھی اب کچھ صبر آگیا ہے — یہ اذیّت — یہ دکھ — یہ غم جیسے میری اپنی ذات کا ایک حصّہ بن گئے ہیں۔ مَیں اب ان کی عادی ہو چکی ہوں —

ہم دونوں — دریا کے دو کناروں کی مانند ساتھ ساتھ چل تو رہے ہیں — لیکن کبھی مل نہیں سکتے!!

اس کا مجھے یقین ہو گیا ہے ۔۔ اُن سے گریز کب تک ممکن تھا۔ ہم ایک ہی جگہ کام کرتے ہیں ۔۔ بعض اوقات ہمیں ایک ہی ڈرامے میں مختلف رول ادا کرنے پڑتے ہیں ، ایک ہی میز پر ہم چائے پیتے ہیں ، اور کام کے متعلق باتیں کرتے ہیں ۔۔ لیکن ہمارے درمیان وہ ان دیکھی خلیج آج بھی حائل ہے ، جسے ہم دونوں میں سے کوئی عبور نہیں کر سکتا ۔۔ جب تک ہمارے درمیان کوئی تیسرا فرد موجود ہوتا ہے ، ہم ہر موضوع پر گفتگو کرتے رہتے ہیں ۔ لیکن جوں ہی ہم اکیلے ہوتے ہیں ، تو جیسے قوتِ گویائی میرا ساتھ چھوڑ جاتی ہے ۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی ۔۔ کچھ نہیں بول سکتی ۔۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ ہمیں کبھی تنہائی میسّر نہ ہو ، کیا فائدہ اب اس سے !!

کل شگفتہ ملی ، تو کہنے لگی :

" احمر کے گھر بیٹا ہوا ہے ۔۔ بڑا خوبصورت گول مٹول سا ہے ۔۔ بالکل ننھا احمر معلوم ہوتا ہے !"

میرا جی چاہا ۔۔ میں اُسے دیکھوں ۔۔ پیار کروں ۔۔ چوموں !

وہ میرے اپنے احمر کا ۔۔ میرے محبوب کا ۔۔ لختِ جگر ہے ۔۔

لیکن یہ کیونکر ممکن تھا ۔۔ میرا بھلا اُس سے کیا رشتہ تھا ۔۔ میں اسے دیکھنے کیسے جا سکتی تھی ۔۔ بس دل مسوس کر رہ گئی ۔۔ ان کے گلشن میں نئے پھول بھی کھل گئے ۔۔ اور اپنی زندگی اب تک ایک اُجاڑ اور چٹیل میدان ہے میں اپنی زندگی کا پُرخار ۔۔ دُشوار گزار ۔۔ اور ویران راستہ تنہا ہی طے کر رہی ہوں ۔۔ میرا ساتھی بچھڑ گیا ۔۔ میرا

ہمسفر کھو گیا ہے ——

میرے راستے میں کوئی سایہ دار درخت نہیں —— جہاں مَیں چند لمحوں کے لیے بھی سستا سکوں — میرے راستے میں گرم دُھول اُڑا کرتی ہے — مَیں اپنا راستہ بھُول گئی ہُوں ——

میری منزل کہاں ہے —— ؟
کون بتائے گا — ؟
کِس سے پُوچھوں —— ؟

۱۵- اکتوبر ۱۹۶۰ء

کل مَیں شگفتہ کے ساتھ ضروریات کی چند چیزیں خریدنے بازار گئی ـــــ تقریباً دو گھنٹے تک ہم لوگ خرید و فروخت کرتے رہے دوپہر ہوگئی ـــــ دھوپ تیز تھی ـــــ پیاس محسوس ہونے لگی ـــ

شگفتہ کہنے لگی :

"قریب ہی احمر کا گھر ہے ـــ چلو وہیں چل کر کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔"

مَیں نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا ـــــ

تو کہنے لگی :

"تم شاید نہیں جانتی ـــــ احمر کی بیگم راشدہ ـــ کسی زمانے میں میری کلاس فیلو رہ چکی ہے ۔ اس کی شادی میں بھی ـــــ مَیں شریک ہوئی تھی ـــــ خوب دھوم دھام سے ہوئی تھی ، اپنے ساتھ ہزاروں کا جہیز لائی تھی ! ـــ بیٹا ـــ کہنا تو نہیں چاہیئے ـــ لیکن کہتی ہوں ـــــ احمر جتنے خوبصورت ہیں ـــــ راشدہ ـــــ اُتنی ہی بدصورت ـــــ یوں لگتا ہے ۔ چاند کو گہن لگ گیا ہو ۔ ذرا بھی تو

جوڑ نہیں — میں حیران ہوں — احمر نے اُسے کیسے قبول کر لیا۔"

"چمکتے زیورات — خوبصورت ملبوسات — نئے ڈیزائن کا فرنیچر — اتنی بہت سی چیزوں میں راشدہ کی بدصورتی کو بھلا — کون دیکھتا — واقعی — دولت ہر عیب کو چھپا لیتی ہے۔"

وہ باتیں کرتی جا رہی تھی — اور میرے لاشعور میں مدتوں کی چھپی ہوئی آرزو — میں احمر کا گھر دیکھوں — اُس کی ماں سے ملوں — آج مچل اُٹھی تھی — میں انکار نہ کر سکی —

ہم اُن کے گھر میں داخل ہوئے — تو اُن کی امّی نے ہمارا خیر مقدم کیا — بھاری جسم — گھنگھریالے بال — اور بڑی بڑی آنکھوں والی اس خاتون میں احمر کی مشابہت بہت نظر آ رہی تھی، وہ ہمیں لے کر کمرے میں آ گئیں —

شگفتہ سے پوچھنے لگیں :

"بہت دن بعد آئی ہو" —

"فرصت نہیں ملی خالہ جان" —

"یہ کون ہیں؟" — وہ میرے بارے میں پوچھنے لگی۔

"میری دوست بینا ہیں — میرے ساتھ کام کرتی ہیں۔"

وہ لوگ رسمی باتوں میں مصروف تھیں — اور میری نگاہیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں — یہ کمرہ خاصا کشادہ تھا — آمنے سامنے دیواروں کے ساتھ دو صوفے سیٹ رکھے ہوئے تھے۔

ایک صوفے پر سیاہ ساٹن کے کشن تھے — اور دُوسرے پر سفید ساٹن کے! — بائیں دیوار کے ساتھ شوکیس میں کتابیں رکھی تھیں۔ اوپر کے خانے میں گتے کی بنی ہوئی ایک گڑیا رکھی تھی — اور سنہری گتے کو کاٹ کر اُس مکان کا ماڈل بنایا گیا تھا — جو دُور سے بہت بھلا لگ رہا تھا — شوکیس کے اُوپر مٹی کی نازک سی صراحی میں گندم کی بالیاں رکھی تھیں — کمرے کے وسط میں سُرخ قالین تھا۔ اور دائیں جانب گرین کلر کا الیکٹرک فین تھا — دروازوں اور کھڑکیوں پر گہرے سبز پردے پڑے تھے۔ سامنے کی دیوار پر چغتائی آرٹ کی ایک تصویر آویزاں تھی — صوفوں کے درمیان شیشم کی — تپائی رکھی تھی۔

احمر کی والدہ نے ہمارے لیے ٹھنڈا مشروب منگوایا۔

شگفتہ نے پوچھا:

"راشدہ کہاں ہیں؟"

"اپنے میکے گئی ہے۔" انھوں نے کہا۔

"مُنّا کیسا ہے؟"

"اچھا ہے — خدوخال احمر جیسے ہیں — ماشاء اللہ بہت صحت مند ہے۔"

وہ بتا رہی تھیں — اور میں سوچ رہی تھی:

یہ احمر کا گھر ہے، — یہ میرے محبوب کا گھر ہے — اس گھر

میں ۔ مجھے آنا تھا ___ لیکن قسمت کے کھیل کون جانتا ہے ___ یہ گھر جو میرا تھا ___ آج میرا نہیں ___ اس گھر پر ___ میرا کوئی حق نہ تھا ___ !!

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہم نے اجازت چاہی ۔ ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ___ اور کمرے سے ملحقہ باتھ روم سے ہوتے ہوئے برآمدے میں آ نکلے ___ سامنے احمر کا کمرہ تھا ___ کمرے کے وسط میں شیشم کی لکڑی کے بنے ہوئے دو پلنگ پڑے تھے ___ دائیں دیوار کے ساتھ دو الماریاں رکھی تھیں ___ ایک میں کانچ کے برتن تھے ___ اور دوسری شاید ملبوسات رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی ___ بائیں دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل تھی ___ ایک طرف احمر کی تصویر رکھی تھی۔ جس میں وہ ہاتھ میں ڈگری تھامے سیاہ گون میں ملبوس کھڑے تھے۔ ایک جانب دیوار پر پینٹ کی ہوئی ایک بڑی سی تصویر لگی تھی ___ پلنگوں کے درمیان ایک ٹیبل تھی ___ جس پر مختلف رسائل کا ڈھیر لگا تھا ___ سامنے کی دیوار کے ساتھ دو کرسیاں اور میز رکھی تھی۔ جو شاید ڈائننگ ٹیبل کا کام دیتی تھی ___ اس کمرے کا دروازہ اگلے کمرے میں کھلتا تھا، جو احمر کی والدہ اور بہن کے استعمال میں تھا۔ اس کمرے میں احمر کی ایک بچپن کی تصویر فریم میں لگی تھی ___ اُن کی والدہ نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا :

" احمر کا بیٹا بھی بالکل ایسا ہی ہے "

اس کمرے میں اُن کے دیگر افرادِ خاندان کی تصاویر فریم میں لگی ہوئی تھیں ——— اس کمرے کا دروازہ بھی برآمدے میں نکلتا تھا ——— وہاں سے نکلے تو سامنے براؤن بالوں والا کتا دکھائی دیا ——— احمر کی والدہ نے بتایا :

" احمر کو جانور پالنے کا بہت شوق ہے۔"

برآمدے سے آگے ——— وسیع صحن تھا ——— جس کے بائیں طرف باورچی خانہ ——— گودام ——— اور باتھ روم وغیرہ تھا ——— اور دائیں جانب ایک اور کمرہ تھا، جو غالباً احمر کے بھائی کا تھا۔ سامنے ستون کے ساتھ ایک پنجرے میں طوطا تھا ———

" اس گھر کے مکینوں کو واقعی جانور پسند ہیں" ——— شگفتہ نے مدھم لہجے میں مجھ سے کہا۔

ہم نے ——— اُن کی والدہ سے اجازت لی ——— اور باہر نکل آئے ——

○

وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا ——— لیکن ——— میری نظر میں ایک محل سے زیادہ پُرکشش تھا ——— وُہ گھر میرے احمر کا تھا نا ——— اس لیے!

احمر کے بیٹے کو ——— دیکھنے کی خواہش دل میں ہی رہ گئی ———
اور نہ ہی ——— میں اُس عورت کو دیکھ سکی ——— جس نے ——— مجھے شکست دی تھی ———

واپس آتے ہوئے بھی شگفتہ راشدہ کی باتیں کرتی رہی۔ کہنے لگی :

" احمر نے راشدہ سے شادی تو کر لی ہے ——— لیکن معلوم ہوتا ہے وہ ذہنی طور پر اُسے قبول نہیں کر سکے ——— احمر جن چیزوں کو ——— پسند کرتے ہیں۔ راشدہ کو ان سے کوئی لگاؤ نہیں ——— اُن دونوں کے خیالات میں بہت بُعد ہے ——— دونوں کے درمیان ایک فاصلہ رہا ——— اور اُس دلی اور ذہنی وابستگی کا فقدان تھا ——— جسے کامیاب ازدواجی زندگی کا سنگِ بنیاد کہا جا سکتا ہے ——— اور شاید ——— یہی چیز انھیں ایک دوسرے کے قریب آنے سے روکتی ہے ، اور مزے کی بات سُنو بینا ——— دونوں ضدی طبیعت کے ہیں ——— جُھکنا ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا ——— راشدہ کی پرورش بڑے نازونعم میں ہوئی تھی ——— اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ ہوسٹل میں گزارا تھا۔ دولت کی فراوانی نے اُسے کسی حد تک ——— مغرور اور خود پسند بنا دیا ہے ——— ہوسٹل میں بھی تمام لڑکیوں پر ——— حکم چلایا کرتی تھی ، ——— اور تقریباً سب ہی ——— اُس کی دولت سے مرعوب تھے ——— ہوسٹل وارڈن بھی کچھ نہ کہتی تھی ——— کیوں کہ نت نئے تحفے ——— اُس کی

زبان پہ تالے لگا دیتے تھے ـــــ اور یوں راشدہ کی زیادتی بھی کسی کو زیادتی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اُس نے کبھی اپنا کوئی کام بھی خود نہیں کیا ـــــ ہوسٹل میں بھی اُس کی رُوم میٹ اُس کے سارے کام کر دیا کرتی تھی ـــــ اور وہ تحفے تحائف دے کر سمجھتی تھی، کہ معاوضہ دے دیا ـــــ اس نے جب جو چاہا ـــــ وہی ہُوا ـــــ جس چیز کو پسند کیا ـــــ اسے حاصل کر لیا ـــــ

اب وہ اپنے ساتھ ہزاروں کا جہیز لائی ہے ـــــ اور سمجھتی ہے کہ اُس نے اس کے عوض احمر اور ان کے گھر والوں کو خرید لیا ہے۔ اس کی شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہونے والا ہے ـــــ لیکن ـــــ اس عرصے میں اس نے کبھی گھر کے کسی کام میں دلچسپی نہیں لی ـــــ میں جب بھی اُس سے ملنے گئی ـــــ وہ سجی بنی پلنگ پر بیٹھی نظر آئی ـــــ وہ چاہتی ہے، کہ یہاں بھی اُس کے ویسے ہی ناز اٹھائے جائیں، جیسے کہ ہوسٹل میں ـــــ یا اُس کے گھر میں اُس کی ہر بات مان لی جاتی تھی۔

لیکن یہاں احمر ہیں ـــــ جو کسی کے سامنے جھکنا نہیں جانتے ـــــ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے۔ وہ بھلا راشدہ کو کہاں ـــــ خاطر میں لاتے ہیں ـــــ اور ـــــ راشدہ تلملا کر رہ جاتی ہے، تب وہ انتقاماً ـــــ اُن کے دیر سے آنے پر باز پُرس کرتی ہے ـــــ کسی لڑکی کے ساتھ وہ ڈرامے میں حصّہ لے لیں ـــــ تو کئی کئی دن تک طعنے دیتی رہتی ہے ـــــ میرے خیال میں احمر کے حُسن نے ـــــ اُسے

احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا ہے ـــ اور پھر اُس پر احمر کا رویّہ ـــ کہ وہ کبھی اس کی تعریف نہیں کرتے! کبھی اس کی کسی عادت کو نہیں سراہتے یہی کچھ سوچ سوچ کر وہ کُڑھتی رہتی ہے ـــ اور یُوں ـــ اُن کی گھریلو فضا ناخوشگوار رہتی ہے ـــ جس میں نہ راشدہ کو سکون میّسر ہے اور نہ احمر کو ـــ

مجھے تو اس پر بھی حیرت ہے ـــ کہ یہ دونوں اب تک ایک گھر میں کیسے رہ رہے ہیں ـــ؟

○

یکم جنوری ۱۹۶۱ء

احمر نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے !!

یہ خبر ـــــ جنگل میں آگ کی مانند ـــــ پُورے اسٹیشن پر پھیل رہی تھی۔

ایک ہفتہ پہلے کی کہی ہوئی شگفتہ کی باتیں ـــــ میرے کانوں میں گونج رہی تھیں ـــــ اُس کے اندیشے ـــــ کتنے درست ثابت ہوئے تھے !

مجھے اَن دیکھی راشدہ سے ہمدردی ہونے لگی ـــــ

احمر ـــــ اُس کے ہو کر بھی ـــــ اُس کے نہ تھے۔ بے انتہا دولت کے ہوتے ہوئے بھی ـــــ وُہ اُن کی محبت حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی ـــــ

راشدہ بے چاری کیا جانتی تھی ـــــ

کہ ـــــ احمر کو جو چیز اپنا پیچھا کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

وہ اُس سے اپنا دامن چھُڑا لیا کرتے تھے ـــــ

اور وہ نادانستگی میں یہی کر رہی تھی ـــــ

وُہ —— اُن سے دیر سے آنے کا سبب پُوچھتی —— وقت پر کھانا نہ کھانے کا جواز مانگتی ——

اور اِن باتوں —— اِن پابندیوں کے وہ عادی نہ تھے —— ہر وُہ شے —— جو اُنھیں اپنے راستے میں حائل ہوتی نظر آتی تھی، —— اُسے ہٹا دیا کرتے تھے —— یا پھر —— اپنا راستہ بدل لیتے تھے ——

اور یہاں بھی انھوں نے یہی کیا ——

اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر —— راشدہ —— اُن سے باز پُرس کرتی تھی ——

اور یہ اُن کی سرکش فطرت کے منافی تھا —— کہ کوئی اُن سے کچھ پُوچھے —— وہ اپنی ذات پر —— سوائے اپنے —— کسی کا حق تسلیم کرنے کے عادی نہ تھے ——

اور یُوں —— راشدہ انجانے میں —— اپنا گھر آپ ہی اُجاڑ بیٹھی ——

مجھے یہ خبر سُن کر بہت دُکھ ہُوا ——

ہمارے معاشرے میں مُطلقہ عورت کا کیا مقام ہے —— ؟ کوئی بھی تو اُسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا —— اب کون اُسے سہارا دے گا ؟ —— کون اُس معصُوم بچےّ کو باپ کی شفقت اور پیار دے گا —— ؟ ایک معصُوم بچہ —— اپنے باپ کے زندہ ہوتے

ہوئے بھی یتیم ہو گیا تھا ——— اُس کی محبت ——— اُس کے پیار سے محروم ہو گیا تھا ———

یہ سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں!

سب باپ ایسے ہی ہوتے ہیں!!

لاشعور میں برسوں کی دبی باتیں ——— اُجاگر ہونے لگیں ——— میرا دل نیم کی سی کڑواہٹ سے لبریز ہو گیا ——— مجھے پاپا کا خیال آ گیا تھا ———

وہ بھی تو زندہ تھے!!!

لیکن ——— کاش! وہ زندہ نہ ہوتے ——— تب اُن کے پیار سے محرومی میرے لیے اس قدر تکلیف دہ نہ ہوتی ——— مجھے اُن کے پیار، اُن کی توجہ کی آج بھی ضرورت تھی ———

لیکن وُہ ———

اپنی دُنیا میں مگن تھے ——— انھوں نے کبھی بھُول کر بھی مجھے یاد نہیں کیا تھا ——— وہ تو میرے وجُود سے ہی بے خبر بن بیٹھے تھے

مرنے والوں پہ صبر آ جاتا ہے ———

لیکن ——— زندہ رہنے والوں کو نظر انداز کر دینا ——— بھلا دینا ——— مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے ——— ایک دھیمی دھیمی آنچ ہمیشہ رُوح کے اندر سُلگتی رہتی ہے۔ جس سے چھٹکارا پانا ہمارے اپنے بس میں نہیں ہوتا ———

احمر نے یہ کیا کیا ؟ —— کیوں کیا ؟ — مَیں پہروں سوچتی۔

تاہم — اُن کا یہ فعل میری نظروں میں —— مستحسن نہ تھا۔

انھوں نے ایک عورت کی زندگی تباہ کر دی تھی ——

ایک بچّے کا مستقبل تاریک کر دیا تھا ——

اور مَیں ——

اِسے کبھی نظر انداز نہ کر سکتی تھی ——

۲۳- جنوری ۱۹۶۱ء

پھر تو یہ ہونے لگا ــــــ کہ میں ہر روز ــــــ احمر سے متعلق ایک نئی بات سُنتی ــــــ

راشدہ کے گھر والوں نے ــــــ اُن پر ــــــ پچاس ہزار کا دعویٰ کر دیا تھا ــــــ یہ وہ روپیہ تھا ــــــ جس کا جہیز اُنھوں نے راشدہ کو دیا تھا ــــــ اور جو شادی کے اخراجات پر ــــــ صرف ہُوا تھا ــــــ

پھر ایک دن سُنا ــــــ

راشدہ کے گھر والے ــــــ جہیز کی فہرست لائے تھے ــــــ اور چند آفیسرز کو درمیان میں لا کر انھوں نے اُس کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا ــــــ

پھر سُنا ــــــ

احمر نے وہ تمام چیزیں واپس کر دی ہیں ــــــ جو راشدہ اپنے ساتھ لائی تھی ــــــ اور اب بھی وُہ کئی ہزار کے مقروض ہو گئے ہیں اور یہ رقم انھیں ایک سال کے اندر اندر ادا کرنی ہے۔

میں خاموش تماشائی کی مانند یہ سب کچھ دیکھتی رہی ——— سُنتی رہی ——— یہ سب کیا ہو گیا تھا ——— میں نے تو کبھی یہ سوچا تک نہ تھا۔

اس واقعے نے ——— احمر کی شخصیّت کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ لوگ دبے دبے لفظوں میں اُن کو نفرین کرتے ——— طرح طرح کی افواہیں اُڑتی رہتیں۔

لیکن احمر خاموش تھے!

انھوں نے کبھی اپنی زبان نہ کھولی ——— کبھی اپنی صفائی میں کچھ نہ کہا ——— وہ یوں مطمئن نظر آتے تھے، جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو ——— یا جیسے ——— یہ کوئی بہت ہی معمولی سی بات ہو ——— جس کی اُن کی نظر میں کوئی وُقعت نہ تھی۔

لیکن میں دیکھتی تھی ———

میں محسوس کرتی تھی ———

کہ ——— وہ اپنے متعلق ایسی باتیں سُن کر خوش نہیں ——— اس سے انھیں کتنی ذہنی تکلیف ہوتی ہو گی ——— اِس کا احساس مجھے خوب تھا ——— کچھ عرصہ پہلے تک وہ اس اسٹیشن کی اہم ترین شخصیّت سمجھے جاتے تھے ——— لیکن ——— آج ایک عام انسان بن کر رہ گئے تھے ——— پہلے وہ لڑکیوں کے حلقے میں خاصے مقبول تھے۔ لیکن آج لڑکیاں انھیں دیکھ کر ایک دُوسری کو بتاتی تھیں:

یہ دولت کے عوض بک گیا تھا ——

اِس نے ایک عورت کی زندگی تباہ کردی ——

ایک بچّے کا مستقبل تاریک کردیا ——

جہیز میں —— کار نہ ملی تھی —— یہ حسرت تو اب دل میں ہی رہ گئی ہوگی ——

انھیں اپنی جنس سے ہمدردی تھی —— وہ راشدہ کی طرف داری کرتی تھیں —— تب میں پل بھر کو سوچتی کیا خبر —— قصور کس کا تھا —— راشدہ کا یا احمر کا —— راشدہ سے قطع تعلق کرکے بھی وہ خوش نہ رہ سکے۔ وہ پریشان رہتے تھے —— وہ دُکھی تھے —— کون جانے اب اس کا سبب —— وہ ہزاروں روپیہ کا قرض تھا۔ جو انھیں ادا کرنا تھا —— یا وہ طرح طرح کی افواہیں تھیں —— جو اُن کی ذات سے منسُوب کردی گئی تھیں ——

احمر کی شادی کے بعد میں نے اُن سے ملنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی لیکن اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ وہ جو کبھی میرا محبُوب تھا —— میرا آئیڈیل تھا۔ میرا سرمایۂ حیات تھا —— آج اتنا دُکھی —— اتنا پریشان تھا —— میں نے کبھی یہ نہ چاہا تھا —— میں تو اپنے حصّے کی خوشیاں بھی انھیں دے دینا چاہتی تھی۔ میں ان کے تمام غموں، تمام دُکھوں کو اپنے آنچل میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ میں نے یہ نہ سیکھا تھا، کہ جس سے ایک بار محبت کی جائے، اس سے کبھی نفرت بھی کی جاسکتی ہے —— یہ میں نہیں دیکھ سکتی —— وہ دُکھی رہیں ——

وہ پریشان رہیں۔

آج میں اُن کے کمرے میں گئی — یہ کمرہ وہی تھا۔ جہاں وُہ پہروں بیٹھ کر اپنائیت کی باتیں کرتے تھے۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھے کاغذات دیکھ رہے تھے — مجھے اندر آتے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں — حیرت جھلکی —

میں آگے بڑھی — اور میز کے قریب آکر انھیں غور سے — دیکھنے لگی — وہ آج بھی اُتنے ہی دلکش تھے — اُن کی آنکھوں میں مسحُور کر دینے والی کشش آج بھی تھی — وہ پیاری پیاری مہک آج بھی اُن کے بدن سے آ رہی تھی — جو کبھی میرے حواس پر نشہ بن کر چھا جاتی تھی !

لیکن — آج میرا دل نہ دھڑکا —

میرا سانس نہ اُلجھا —

میری شدید چاہت کے دہکتے ہوئے انگاروں پر ان کی سرد مہری کی جو دبیز راکھ پڑی تھی — اُسے ہوا کا کوئی جھونکا نہ اُڑا سکا —

مدھم مدھم لہجے میں میں نے اُن سے کہا :

" احمر — میں نے سُنا ہے — آپ پریشان ہیں — یہ چیزیں میں نے اپنی تنخواہ میں سے بچا کر خریدی ہیں — اور یہ کچھ تھوڑے سے پیسے — بنک میں رکھے تھے — یہ سب میں آپ کو دینا چاہتی ہُوں — شاید — اِن سے آپ اپنے قرض کا بوجھ کسی حد

تک کم کر سکیں" ——

مَیں نے ڈبّہ میز پر رکھ دیا ——

جگمگاتے زیورات — اور سرسراتے نوٹوں پر انھوں نے

ایک نگاہ ڈالی — اور شرمندگی سے سر جھکا لیا ——

مَیں اس کمرے سے لوٹ آئی ——

یہ سب کچھ کرنے سے — مجھے ایک عجیب سی تسکین ——

ایک سکون حاصل ہُوا تھا ——

○

۱۶- جون ۱۹۶۱ء

کتنے ہی مہینے گزر گئے —— ویسے ہی بے کیف دن —— اور ویران راتیں —— زندگی میں کوئی رنگینی نہ تھی —— کوئی خوشی نہ تھی —— لیکن پھر بھی مَیں زندہ تھی ——

اور وقت گزر رہا تھا !

ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو مَیں اپنی تنخواہ کی بیشتر رقم —— احمر کے نام منی آرڈر کر دیتی —— مَیں یہ نہیں چاہتی تھی —— کہ مَیں بار بار اُن کے سامنے جاکر اُن کو شرمسار کروں —— اسی لیے مَیں نے پوسٹ آفس کا سہارا لیا تھا ——

جب بھی مَیں پوسٹ آفس سے واپس لوٹتی —— ایک عجیب طرح کی تسکین مجھے مِلتی —— یہ احساس —— کہ مَیں اُن کے لیے کچھ کر رہی ہوُں —— جو میرے کسی کام نہ آسکے تھے —— مجھے —— اپنی نظروں میں بلند کر دیتا ہے —— مَیں آج بھی اُنھیں چاہتی ہوُں —— ان سے محبت کرتی ہوں —— یہ چار سال میرے جذبے —— میری لگن —— میری چاہت میں کوئی کمی نہ کر سکے —— اُسے نہ مٹا سکے ——

ان کا خیال ـــــ ان کی یاد ـــــ مجھے لگتا ہے، جیسے میری رُوح کا ایک حصّہ ہے، اور جس دن یہ نہ رہا۔۔ تو کچھ باقی نہ رہے گا۔

مَیں اُن سے محبت کرتی ہُوں ـــــــ

یہ سوچے بغیر ـــــ کہ وہ اِس کے بدلے مجھے اپنی چاہت اپنی محبت دیں گے ـــــ

سچ بات تو یہ ہے ـــــ کہ یہ میرے اختیار میں ہی نہیں ـــــ کہ مَیں انھیں یاد نہ کروں ـــــ کوئی صبح ایسی طلوع نہیں ہوتی ـــــ جب آنکھ کھُلتے ہی میرے ذہن میں ان کا تصوّر نہ ہو ـــــ کوئی رات ایسی نہیں آتی جب میری زبان پر اُن کا نام نہ آیا ہو ـــــ

میری محبت بدلہ نہیں چاہتی ـــــ صلہ نہیں چاہتی ـــــ وہ محبت جس میں صلے کی تمنّا کی جائے ـــــ محبت نہیں ہوتی ـــــ محبت میں انسان دیتا سب کچھ ہے ـــــ لیکن ـ بدلے کی تمنا نہیں کرتا۔ جبھی تو آج تک اُن کے اِتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی ـــــ مجھے اُن سے نفرت نہیں ہوئی ـــــ مَیں انھیں نظر انداز نہیں کرسکی !!

باوجود اس کے ـــــ کہ مَیں اُن سے نہیں مِلتی ـــــ مِلنے کی کوشش تک نہیں کرتی ـــــ وہ میرے ذہن سے ـــــ کبھی محو نہیں ہوتے ـــــ

آج شام ـــــ جب مَیں پروگرام کرنے کے لیے اسٹیشن گئی تو شگفتہ مجھے گیٹ کے قریب ہی مل گئی ـــــ وہ بے حد گھبرائی

ہوئی تھی ——

کہنے لگی :

"تم نے کچھ سُنا بیٹا —— ابھی کچھ دیر پہلے —— جب احمر اسٹیشن کی طرف آ رہے تھے —— کسی نے اُن پر چلتی ہوئی کار سے گولی چلائی تھی —— انھیں سخت زخمی حالت میں ہاسپٹل لے جایا گیا ہے

لوگوں کا خیال ہے —— کہ یہ سب راشدہ کے عزیزوں کا کیا دھرا ہے —— ان کے خاندان میں طلاق کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے —— انھوں نے انتقام لے لیا بیٹا" ——

خدا جانے وہ کیا کچھ کہتی رہی —— میں نے تو بس یہی سُنا تھا، وہ زخمی حالت میں —— ہاسپٹل لے جائے گئے ہیں، اُن پر چلتی کار سے کسی نے گولی چلائی ہے ——

وہ زخمی ہیں ——

وہ زخمی ہیں ——

میں سکتے کی سی حالت میں کھڑی تھی —— جانو —— جیسے جسم میں خون کی ایک بوند نہ ہو ——

پھر مجھے نہیں خبر —— میں کیسے ہاسپٹل پہنچی —— ؟

وہ سفید بستر پر دراز تھے —— گردن تک اُن کا جسم سُرخ کمبل سے ڈھکا ہُوا تھا —— اُن کا چہرہ —— جو کبھی خون کی سُرخی سے جگمگاتا رہتا تھا —— دُھلے لٹھے کی مانند سفید تھا —— وُہ

خوبصورت سحر انگیز آنکھیں آج بند تھیں ــــ پیشانی پسینے سے تر تھی جس پر پسینے کی نمی کی وجہ سے کچھ بال چپک سے گئے تھے۔

ڈاکٹر ــــ اُن کے بستر کے قریب کھڑا ــــ اُن کی نبض چیک کر رہا تھا ــــ

"ڈاکٹر ــــ

ان کی حالت کیسی ہے ــ ؟ یہ بچ تو جائیں گے نا ڈاکٹر" ــــ

مَیں امید و بیم کی سی حالت میں پوچھ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے ایک نظر مجھ پر ڈالی ــــ

پھر بولا :

"اِن کا بہت سا خون ضائع ہو گیا ہے ــــ انھیں خون کی ضرورت ہے ــــ اور بدقسمتی سے ــــ اس وقت ہمارے پاس اِن کے گروپ کا خون موجود نہیں ــــ اگر کہیں سے خون دستیاب ہو جائے تو ــــ"

"انھیں خون کی ضرورت ہے ــــ لیکن خون ــــ کہیں سے نہیں مل رہا ــــ" نیم بے ہوشی کی سی حالت میں ــــ مَیں نے یہ الفاظ دُہرائے ــــ

"ڈاکٹر ــــ

مَیں خون دینے کے لیے تیار ہوں ــــ میرا خون ٹیسٹ کر لیجیے ــــ خدارا ــــ جلدی کیجیے" ــــ مَیں چلّا اُٹھی ــــ

ڈاکٹر نے مجھے لیبارٹری میں بھجوا دیا ——

وہ وقت —— جب تک خون چیک کیا جاتا رہا — میں نے

عجیب جان کنی کے سے عالم میں گزارا ——

آہ ——

میں کہہ نہیں سکتی ——

میرا کیا عالم تھا —— میرے ذہن میں —— صرف ایک

خیال گردش کر رہا تھا ——

احمر موت کے دہانے پہ کھڑے ہیں ——

احمر -----

میرا محبوب ——

میں کوئی بدشگونی نہ کرنا چاہتی تھی ——

میں یہ تصوّر بھی نہ کرنا چاہتی تھی ——

کہ —— انھیں کچھ ہو جائے ——

میں اپنے آنسو ضبط کرتی رہی —— اور دل ہی دل میں

اُن کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی ——

اس تھوڑے سے وقفے میں ——

میں نے کتنی ہی بار یہ دعا مانگی :

کہ خدا —— انھیں میری زندگی بھی دے دے —— اور

وہ سلامت رہیں !!

کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر نے بتا دیا ——

کہ —— اتفاق سے —— میرے خون کا گروپ وہی ہے ——

جو احمر کا ہے ——

پھر مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا ——

سفید بستر پہ دراز —— میں اپنے بازو میں لگی ہوئی اُس نڈل

کو دیکھتی رہی، جس کے ذریعے قطرہ قطرہ کرکے خون سامنے ٹیبل

پہ رکھی ہوئی بوتل میں جمع ہو رہا تھا ——

ایک گھنٹہ گزر گیا ——

مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی ——

۱۷- جُون ۱۹۶۱ء

میری آنکھ کھُلی ـــــ تو ـــــ نرس میری نبض ـــــ

دیکھ رہی تھی ـــــ

پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا ـــــ

وُہ احمر کا تھا ـــــ

" احمر کیسے ہیں ـــــ ؟ "

تھکے تھکے لہجے میں ـــــ مَیں نے پُوچھا۔

نرس مُسکرائی ـــــ

پھر بولی :

" آپ کے خون نے ـــــ ایک انسان کی زندگی بچالی ہے،

مِس بینا ـــــ مَیں آپ کو مبارک دیتی ہُوں ! "

" وہ ٹھیک ہیں ـــــ ! "

جیسے میرا سارا بوجھ اُتر گیا ـــــ میرے خُون نے اُنھیں

زندگی بخشی ہے ـــــ اس احساس سے ـــــ ایک سکون آمیز

طمانیت میری رگ رگ میں پھیل گئی ـــــ

مَیں نے دھیرے سے کروٹ لی ——
اور آنکھیں بند کرلیں ——

○

"آپ بہت کمزور ہوگئی ہیں —— مس بینا —— ! کچھ روز آپ کو ہاسپٹل میں رہنا ہوگا" —— اُسی شام کو ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا۔

"وہ مریض اب کیسا ہے ؟" —— میں ضبط نہ کرسکی تھی۔

"احمر —— وہ تو اب بالکل ٹھیک ہیں —— صرف کمزوری باقی ہے۔ وہ بھی کچھ روز میں دُور ہو جائے گی —— اِس وقت وہ بڑے آرام کی نیند سو رہے ہیں —— آپ مطمئن رہیے۔"

میرا چارٹ —— چیک کرتے کرتے اُس نے اتنی تفصیل سے مجھے احمر کا حال سُنایا ——

اور پھر اچانک پُوچھ بیٹھا :

"اُن سے آپ کا کیا رشتہ ہے ؟"

"ہاں —— میرا اُن سے کیا رشتہ ہے ؟" —— مَیں نے اپنے آپ سے پُوچھا —— "کچھ بھی تو نہیں —— یا شاید جنم جنم کا رشتہ ہے، ایسا رشتہ —— جسے کوئی نہیں دیکھ سکتا —— کوئی نہیں توڑ سکتا۔"

مجھے خاموش دیکھ کر اس کے چہرے پر ——— ایک پُر معنی مسکراہٹ پھیل گئی ——— اُس نے ہولے سے میرا ہاتھ تھپتھپایا، اور آگے بڑھ گیا!

شام کو شگفتہ اور بیگم اختر مجھے دیکھنے آئیں ——— بیگم اختر کے سامنے میری نگاہیں نہ اٹھتی تھیں ——— لیکن وہ بڑی سمجھدار خاتون ہیں۔ انھوں نے اشارتاً بھی احمر کا ذکر نہ کیا ——— وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں ——— پھر مالٹے کا رس نکال کر پلایا ——— اور کچھ دن ہاسپٹل میں رہنے کی تاکید کرنے لگیں۔

وہ چلی گئیں ———

لیکن ——— شگفتہ میرے پاس ہی ٹھہر گئی ———

"ارے بنیا ——— یہ تمھیں سوجھی کیا؟" وہ پُوچھنے لگی۔

"زندگی کا اس سے بڑھ کر مصرف کیا ہو سکتا ہے، کہ وہ کسی کے کام آجائے ———" میں نے کہا۔

"ارے اب بہلاؤ مت مجھے ——— ہر کسی کے لیے ——— یُوں اِنسان اپنی زندگی سے نہیں کھیل سکتا ——— کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے" وہ شرارت سے بولی۔

"کچھ بھی تو نہیں" ——— میں نے اُسے ٹالنا چاہا ——— "اب دیکھو نا ——— جب تم نے مجھے یہ خبر سنائی تھی ——— تو تمھارا کیا حال تھا؟"

"ہاں بھئی ——— اس حادثے کا رنج تو مجھے بھی بہت تھا ——— اور

پھر یہ اس قدر اچانک تھا —— کہ کتنی ہی دیر تک تو ذہن میرا ساتھ ہی نہ دیتا تھا ——

"تو پھر —— اس حادثے سے میں کیوں کر متاثر نہ ہوتی۔" میں نے اُس کی کہی ہوئی بات سے ہی مطمئن کرنا چاہا۔

اِس وقت رات گہری ہونے لگی تھی —— میں بیحد نقاہت محسوس کر رہی تھی —— آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا —— اور ہاتھ برف کی مانند سرد ہو رہے تھے۔

شگفتہ نے —— دُودھ منگوا کر مجھے پلایا —— اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی ——

۲۲- جون ۱۹۶۱ء

پانچ روز گزر گئے ___ ہر روز مجھے ڈاکٹر یا نرس سے ان کے بتدریج صحت یاب ہونے کی اطلاع ملتی رہتی ___ میں خود بھی ایک بار کمرے کے باہر ہی سے انھیں دیکھ کر واپس لوٹ آئی تھی ___ میں اندر کمرے میں جا کر اپنا احسان جتانا نہ چاہتی تھی ___ میں نہیں چاہتی تھی، کہ وہ شرمسار ہوں ___

اُن کی حالت اب پہلے سے بہت بہتر تھی ___ لیکن ___ مجھے کبھی کبھی یُوں لگتا تھا ___ جیسے میرے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔ میری نبضیں چلتے چلتے رُک جائیں گی ___ کبھی کبھی تو یہ اختلاجی کیفیت اتنی بڑھ جاتی ___ کہ میں نڈھال ہو جاتی ___ میرے ہاتھ برف کی مانند سرد ہو جاتے، اور میں مضمحل سی ہو کر بستر پہ گر پڑتی۔

اِس شام بھی میری یہی کیفیت تھی ___ اختلاجِ قلب بڑھتا چلا جا رہا تھا ___ ایک نامعلوم سا مغموم گھراؤ ___ میرے دل کو کچھ اس طرح ٹھنڈے اور گھرے بادلوں میں ڈھکے ہُوئے تھا ___ جس سے چھن کر ___ کوئی سنہری اور خوشگوار کرن ___ آتی معلوم

نہ ہوتی تھی۔

میں نڈھال سی —— آنکھیں بند کیے —— بستر پہ لیٹی تھی۔ شام کے سُرمئی سائے گہرے ہو چلے تھے —— کمرے میں اندھیرا بڑھتا چلا جا رہا تھا ——

نرس کمرے میں داخل ہوئی —— لائٹ جلائی —— اور مجھے سوتا سمجھ کر دبے پاؤں کمرے سے نکل گئی ——

اچانک آہٹ ہوئی —— کوئی سبک خرامی سے چلتا ہوا —— میرے بستر کے قریب آ گیا۔

"بلینا ——"

کسی نے مدھم آواز میں پکارا ——

یہ آواز —— یہ آواز تو میں ہزاروں آوازوں میں —— پہچان سکتی ہوں۔

احمر —— تم کیوں آئے —— کیوں آئے —— میرے صبر میرے ضبط کو متزلزل کرنے کے لیے —— کہیں ٹھہرے پانی میں تموج نہ پیدا ہو جائے ——

"بلینا —— آنکھیں کھولو —— بلینا ——" وہ شیریں آواز مجھے بلا رہی تھی ——

میں نے آنکھیں کھول لیں!

وہ سفید شرٹ —— اور سفید پینٹ میں ملبوس میرے بستر کے

قریب کھڑے تھے ـــــ اُن کے چہرے کی زردی اب ہلکی ہلکی سرخی میں تبدیل ہو چکی تھی ـــــ ان کے ایک بازو میں سفید پٹی اب تک بندھی ہوئی تھی ـــــ

وہ آگے بڑھے، اور میرا ہاتھ تھام لیا ـــــ

" بینا ـــــ مجھے معاف کر دو بینا ـــــ تم کتنی اچھی ہو ـــــ اور میں کتنا بُرا ہوں ـــــ میں نے تمھیں بہت دُکھ دیئے ہیں ـــــ مجھے معاف کر دو۔"

وہ جو زندگی میں کسی کے آگے نہ جھکے تھے ـــــ آج مجھ سے معافی مانگ رہے تھے ـــــ جھک رہے تھے ـــــ

" مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ـــــ کوئی شکایت نہیں۔" میں سرد لہجے میں بولی، اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

" بینا ـــــ یوں اجنبی نہ بنو ـــــ اتنی غیریت سے پیش نہ آؤ ـــــ اب میرے اور تمھارے درمیان کوئی حائل نہیں ـــــ میں اُن چاندی کی دیواروں سے ـــــ دُور چلا آیا ہوں ـــــ مجھے قبول کر لو ـــــ مجھے اپنا لو ـــــ"

اوہ ـــــ یہ احمر کہہ رہے تھے۔

یہ بے ثمر خیالوں میں اُلجھنے کا وقت نہ تھا ـــــ زندگی اور موت میں صرف ایک قدم کا بُعد تھا ـــــ میرے پیچھے خاک اُڑاتے گرم صحرا تھے ـــــ اور سامنے بہار کے شگوفوں کی مانند لہراتی اور

مسکراتی زندگی ـــــ

لیکن نہیں ـــ اب وقت گزر چکا ہے۔ کاش! یہ بات احمر آج سے پانچ سال قبل کہتے، تب میں ایک پل کو بھی کچھ نہ سوچتی، ــــ لیکن اب وقت گزر گیا ہے ـــ اور گزرا وقت، کبھی لوٹ کر نہیں آتا ـــ انتظار ـــ مسلسل انتظار نے میری ہر خواہش ـــ ہر آرزو کا رنگ چھین لیا ہے ـــ میرے ہر گیت کا شعلہ دھواں بن چکا ہے۔ ان کے رویّے نے میرے ہر احساس کو زخمی کر دیا تھا ـــ میرے دل کا آبگینہ یوں چور چور ہو گیا تھا، کہ اس کی کرچیاں چنتے چنتے، میرا ہر جذبہ ـــ ہر خیال ـــ ہر آرزو ـــ لہولہان ہو گئی تھی ـــ کبھی ٹوٹا ہوا آئینہ بھی جڑ سکتا ہے ـــ اُن کے رویّے نے مایوسی ـــ بدگمانی ـــ بے یقینی کا جو زہر عطا کیا تھا ـــ وہ میری رگ رگ میں گردش کر رہا ہے ـــ اب میں اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتی ـــ میں احمر پہ اعتماد نہیں کر سکتی ـــ بھروسہ نہیں کر سکتی ـــ

گو ـــ ناکام محبت نے مجھے بہت تڑپایا تھا ـــ لیکن اب میں اپنے حال پر قانع تھی ـــ اپنے درد کو دل کی گہرائیوں میں دفن کر کے ـــ دوسروں کا غم کھانا ـــ اور اُن کے دُکھ کا مداوا کرنا ہی اپنا نصب العین بنا چکی تھی ـــ اب جب کہ میں اپنے ویران راستوں پر چل نکلی تھی ـــ تو وہ اب مجھے کیوں پکار رہے ہیں ـــ

لیکن اب مَیں لوٹ کر نہیں آسکتی ـــــ نہیں آسکتی ـــــ

مَیں اپنے خیالوں میں ـــــ اُلجھی ہوئی تھی ـــــ کہ اُن کی آواز سنائی دی ـــــ

"خاموش کیوں ہو بیٹا ـــــ کچھ تو کہو"ـــــ

"آپ نے کیا کہا تھا احمر ـــــ آپ سوچیے ـــــ میں ایک غریب اور نادار لڑکی ـــــ بھلا آپ کو کیا دے سکتی ہُوں ـــــ آپ بھول رہے ہیں ـــ ایک بار پھر سوچ لیجیے"ـــــ

"مجھے تمھاری ضرورت ہے ـــــ تمھاری ضرورت ہے بیٹا"۔ وہ گڑگڑائے۔

"ضرورت ـــــ اور پھر میری ضرورت ـــــ" میرے چہرے پر ایک روندی ہوئی مُسکراہٹ آگئی ـــــ میرے لہجے میں، میری ناکام آرزوؤں، ناکام تمناؤں کی تلخی گھُلنے لگی ـــــ

مَیں نے کہا :

"احمر ـــــ تم اُن نایاب چیزوں میں سے ہو، جو اُس وقت دستیاب ہوتی ہیں۔ جب اُن کی ضرورت نہیں رہتی ـــــ اور جب ان کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ اُن کی خواہش ہوتی ہے ـــــ تو وہ کبھی نہیں ملتیں ـــــ کیسی عجیب بات ہے ـــــ جب مجھے تمھاری ضرورت تھی ـــ تو تمھیں میری ضرورت نہ تھی، ـــ اب جب کہ مُجھے تمھاری ضرورت نہ رہی ـــــ تمھاری تمنا نہ رہی ـــ تو تم مُجھے

اپنانے کی خواہش کر رہے ہو۔"

"ایسا نہ کہو ــــ بیٹا ــــ ہم دونوں کو ایک دُوسرے کی ضرورت ہے۔" وہ ملتجی لہجے میں بولے۔

"آہ ــــ تمھیں اس کا خیال پہلے کیوں نہ آیا احمر ــــ تم نے پہلے اس پر غور کیوں نہ کیا احمر ــــ" میری آواز میں میری آرزوئیں سِسکنے لگیں۔

وہ وقت ــــ جب میں تمھارے قریب ہوتی تھی ــــ جب طوفانی جذبات ــــ باغی احساسات، میرے قلب پر ــــ میرے حواس پر غالب آجاتے تھے ــــ جب میں تمھاری ہر کمزوری ــ ہر عیب کو نظر انداز کر دیتی تھی ــــ

تب ــــ میرا اضطراب ــــ میری پریشانی ــــ میری آہیں یہ ظاہر نہیں کرتی تھیں ــــ کہ میں تمھیں چاہتی ہُوں ــــ تمھیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کو بے تاب ہُوں ــــ میں تمھارے ساتھ ایک خوبصورت ماحول میں پہنچ کر اپنے سارے دُکھ درد بھُول جانا چاہتی ہُوں ــــ

تب ــــ تمھیں اس کا احساس نہ ہُوا تھا ــــ تب تو تم نے سب سے زیادہ تکلیف دہ روش اپنائی ہوئی تھی ــــ تم مجھے بلاتے تھے ــــ اور ــــ خود نہ آتے تھے ــــ کاش! تم اُن لمحوں کا صرف تصوّر ہی کر سکو ــــ جب میرا ذہن شعلوں کا آتشکدہ

بن جاتا تھا ۔۔۔ میرے چہرے پہ مایوسی کی راکھ اُڑنے لگتی تھی ۔۔۔
میرا دل خون کے قطروں میں منتقل ہو کر آنکھوں سے ۔۔۔ بہہ نکلتا تھا۔
تم مجھ سے میری وہ تمام مسرتیں ۔۔۔ وہ تمام خوشیاں چھین لیا کرتے تھے
جن کی مَیں مستحق تھی ۔۔۔ تب میرے پاس کچھ نہ رہتا تھا ۔۔۔ میرے
چہار سُو خزاں کے اذیّت ناک اندھیرے بڑھتے چلے آتے تھے ۔
میرا دم گھُٹنے لگتا تھا ۔۔۔ یہ تنہائی ۔۔۔ یہ اندھیرے ۔۔۔ مجھے اپنی
لپیٹ میں لے لیتے تھے ۔۔۔ میں گھبرا کر تمھیں پکارتی تھی ۔۔۔
بلاتی تھی ۔۔۔ لیکن کہیں سے تمھاری آواز نہ آتی تھی ۔۔۔ تمھاری جھلک
دکھائی نہ دیتی تھی ۔۔۔ اور ان اندھیروں ۔۔۔ اِن تنہائیوں ۔۔۔
اِن آندھیوں میں بھٹکنے کے لیے مَیں تنہا رہ جاتی تھی ۔۔۔ اور پھر یہ
طوفان اپنی تیزی میں ۔۔۔ میری ساری ہمتیں ۔۔۔ سارے عزائم ۔۔۔
ساری آرزوئیں بہا کر لے گیا ۔۔۔ اور میرے پاس کچھ بھی نہ بچا ۔۔۔

کیا تم نہ جانتے تھے ۔۔۔ کہ سپنے جب ٹوٹ جاتے ہیں ۔۔۔ خیال
جب بکھر جاتے ہیں ۔۔۔ تو دوبارہ ترتیب نہیں پا سکتے ؟

دنیا کا کوئی معالج دل سے اُس حصّے کو دوبارہ پیدا کر سکتا ہے
جو آنسوؤں کے چند قطروں میں منتقل ہو کر بہہ چکا ہو ؟

پھُول جب شاخ سے گِر جائے ۔۔۔ تو دوبارہ کبھی شاخ پہ نہیں
کِھل سکتا ۔۔۔ کیا تم نہیں سمجھتے تھے ؟

میری آرزوؤں کی معصوم کلیاں ۔۔۔ خوابناک آنکھوں سے

مدتوں اپنی بربادی پر ماتم کناں رہیں — لیکن تم تسلّی دینے کبھی نہ آئے — میں جب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں — تو اَن گنت ناکام حسرتیں، ماضی کے وسیع دامن میں پنہاں نظر آتی ہیں —

تم نے مجھے کیا دیا — سوائے آنسوؤں کے — وہ اُمنڈتے ہوئے آنسو — جو خاموشی سے میں نے اپنے سینے میں اُتار لیے، جو گھُٹ گھُٹ کر انگارے بنتے گئے — اور — میری خرمنِ ہستی کو پھُونک ڈالا —

میری ساری زندگی — ایک گھُٹی ہوئی طویل آہ بن کر رہ گئی، جو لبوں سے پھُوٹتی نہیں — صرف محسوس کی جا سکتی ہے — لیکن تم نے محسوس نہ کیا — تم نے سنجیدگی سے میرے بارے میں کبھی نہ سوچا — تم میں کسی کا درد — کسی کا دُکھ محسوس کرنے کی حس ہی نہ تھی — تم میں کسی کو کچھ دے دینے کا جذبہ ہی نہ تھا — تم دوسروں سے زیادہ — اپنے آپ سے پیار کرتے رہے۔

تم ہمیشہ اپنی ذات کے خول میں بند رہے — تمھاری سوچوں کے دائرے، تمھاری اپنی ذات تک محدود تھے — کاش، اپنی شخصیت کے قلعے سے باہر نکل کر تم نے دیکھا ہوتا — کہ میری محبت — اپنی تمام صداقتوں کے ساتھ — تمھارے لیے چشم براہ تھی۔ لیکن قلعے کی دیواریں تو بہت اُونچی تھیں، تم باہر نہ نکل سکے — تم کچھ نہ دیکھ سکے احمر —

تم تو اُس، سُوکھے بادل کی مانند تھے —— جو اپنے آپ میں مگن فضاؤں میں اُوپر اور اُوپر پرواز کرتا رہتا ہے۔ جس کی آغوش میں پانی کی ایک بُوند تک نہیں ہوتی —— جو کبھی نہیں جُھکتا —— کبھی نہیں برستا ——

اور یُوں میَں دھرتی کا پیاسا ہونٹ بن کر رہ گئی ——

میَں نے تمھیں بھُولنے کی کوشش کی —— اور ایسا کرنے کے لیے میَں نے اپنے سارے چراغ گُل کر دیئے، مُبادا اُجالے کی کوئی کرن تمھاری یاد کی راہنمائی کرے —— میَں نے اپنے دل کے سارے دریچے بند کر دیئے —— مبادا کہیں یہ سرکش ہوا —— تمھاری یاد کو میرے گھر کا پتہ دے دے۔

مگر پھر بھی تمھاری یاد —— ہر روز —— ہر شام —— کسی نہ کسی در سے، کسی نہ کسی دریچے سے میرے اندھیرے دل میں راہ پا لیتی —— تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا تھا، احمر —— تم جو اتنے اچھے —— اتنے مہربان —— اتنے پیارے تھے ——

تم خوش لباس ہو —— تم خوبصورت ہو —— تعلیم یافتہ ہو —— سوسائٹی کے آداب سے واقف ہو —— پھر تم میں انسانیت کا جذبہ مفقود کیوں ہے؟ —— تمھاری خوبصورتی مکمل ہے —— جب میَں نے تمھیں پہلی بار دیکھا تھا، تو مجھے اپالو کے مجسمے کا خیال آیا تھا ——

واقعی تم اُس خوبصورت مجسمے کی مانند ہو —— جس کا ہر نقش اپنی

جگہ سڈول، خوبصورت ـــ اور جاوداں ہو ـــ لیکن دل زندگی کی حرارت سے محروم ہو ـــ

تمھارا دل بھی ایک تراشے پتھر کی مانند ہے، جس میں کوئی جذبہ نہیں جاگتا ـ کوئی خیال انگڑائی نہیں لیتا ـ کوئی آرزو نہیں ہمکتی۔

تمھاری خوبصورتی ـــ سورج کی طرح آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی ہے ـــ ایسی خوبصورتی ـــ جو چبھن پیدا کرتی ہے خلش جگائے رہتی ہے ـــ

تمھاری باتیں ـــ جو سکون نہیں بخشتیں ـــ بلکہ اندھیرے کے جنگلوں میں بھٹکائے رکھتی ہیں ـــ ایسی باتیں جن کا سُراغ کوئی نہیں پا سکتا ـــ تم محض مذاق کر سکتے ہو ـ وقت گزار سکتے ہو ـــ زندگی کے ساتھی نہیں بن سکتے، کبھی نہیں بن سکتے!

میں بے ساختگی کے عالم میں نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی ـــ مُدتوں کا دبا ہُوا لاوا ـــ پھُوٹ بہا تھا ـــ اور اب اس پر میں قابو نہ پا سکتی تھی ـــ

"میں نادم ہوں بینا ـــ شرمسار ہوں بینا ـــ اِن گزُری باتوں کو بھُول جاؤ ـــ آؤ ـــ کہ اب ہم مل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔"

یہ بات ـــ جو تم آج کہہ رہے ہو ـــ تمھیں آج سے پانچ برس پہلے کہنی چاہیئے تھی ـــ ہر بات کا ایک موقع ہوتا ہے

ایک وقت ہوتا ہے ——

اگر —— اُس وقت تم یہ کہتے —— تو شاید میں اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی —— تصوّر کرتی ——

لیکن —— اِن پانچ برسوں نے مجھے —— جو بے یقینی —— جو بد گمانی —— اور جو مایوسی عطا کی ہے ، اسے اب تمھارے الفاظ زائل کرنے کی قوت نہیں رکھتے —— مجھے تمھاری کسی بات پر یقین نہیں آسکتا —— میں اب اپنے آپ کو مزید فریب نہیں دے سکتی —— میں تمھارے لیے نسوانی جسم کا ایک خیال ہُوں ، جسے تم اپنی تنہائی رفع کرنے کے لیے گوارا کر رہے ہو —— محض مشغلے کے طور پر —— ہم دونوں میں —— کس قدر رُوحانی بُعد ہے —— یہ میں جان گئی ہوں۔ اسی لیے مجھے تمھارا ساتھ گوارا نہیں ——

وہ وقت گزر گیا ہے —— جب مجھے تمھاری ضرورت تھی —— تمھاری تمنا تھی —— لیکن آج مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیئے —— کچھ بھی نہیں —— میری طرف سے تم بالکل آزاد ہو —— جیسے مجھ سے ملنے سے پہلے تھے —— میں تمھاری راہ میں کبھی حائل نہ ہوں گی —— کبھی بوجھ نہ بنوں گی —— !!

اور اب آپ یہاں سے چلے جایئے احمد صاحب —— اور پھر پلٹ کر کبھی نہ آیئے گا —— اور ہاں جاتے جاتے مہربانی کر کے یہ روشنی بند کرتے جایئے ، کہ بڑی مدت بعد میں آج سکون کی نیند سونا چاہتی ہُوں !

انھوں نے مایوس ہو کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا — اور لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھے — اُن کی چال مدھم اور شکست خوردہ تھی — وہ متانت اور لااُبالی پن — جو اُن کے لیے مخصوص تھا — آج آہستگی — ماندگی — اور بے خواب ناکام خواہش میں متبدل ہو گیا تھا —

مَیں آج اپنی زندگی کے ساتھی سے بچھڑ رہی تھی — اپنی خوشی سے — ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی تھی۔

انھوں نے کمرے سے نکلنے سے قبل لائٹ بند کر دی — ہر سُو اندھیرا چھا گیا — مَیں اُن کی پرچھائیں اندھیرے میں تحلیل ہوتی دیکھتی رہی۔

اندھیرا گہرا ہوتا گیا — اور گہرا —

جدھر نگاہ اٹھاؤ — اندھیرا تھا — تاریکی تھی —

اور پھر یہ اندھیرا — میری رُوح — میرے خیالات — میرے جذبات پر چھا گیا۔

اُن کے قدموں کی آواز دور ہوتی گئی — جیسے وہ نہیں — میری امید کا آخری سایہ — ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں کھو گیا ہو۔

مَیں نے آخری بار —

اپنے محبُوب —

اپنے آئیڈیل کو پیار کیا —

میری آنکھوں میں ــــ دو ننھے ننھے آنسو جھلملائے ــــ

یہ ایک ناکام محبت کے آنسو ہیں ــــ جس نے پیار کی بازی جیت کر ہار دی تھی ــــ

یہ وہ چراغ ہیں ــــ

جو دل کی قبر پر روشن کیے جاتے ہیں ــــ اور اب یہ چراغ تا عمر جلتے رہیں گے ــــ!!

پُراسرار، سنسنی خیز، دلچسپ، قہقہہ انگیز

کیپٹن شہزاد سیریز

جاسوسی ناولوں کے اس سلسلے کی نمایاں ترین خصوصیت کیپٹن شہزاد، شہزادہ قلی علی خاں، انسپکٹر فاضل بیگ اور انسپکٹر مولا بخش کے دلچسپ پراسرار کردار ہیں۔ جن کے کارنامے پڑھ کر قاری اپنے تھکے ہوئے ذہن و اعصاب کو پُرسکون محسوس کرتا ہے۔

اس سلسلے کا اجراء محض وقت گزاری کے لیے ہی نہیں، بلکہ مقصدیت بھی پیشِ نظر ہے۔ اشو نعمانی نے اپنی تحریر میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ قاری کے فکر و عمل کو اعلےٰ اقدار کی طرف مائل کرے۔ اس سیریز کی ہر کتاب پُراسرار، سنسنی خیز، دلچسپ اور قہقہہ انگیز واقعات کی بنا پہ ناقابلِ فراموش ہے۔

ہر ماہ یکم تاریخ کو ایک نیا ناول پیش کیا جاتا ہے

اپنے قریبی بکسٹال سے طلب فرمایئے

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ✿ حیدر آباد ✿ کراچی